پہلا باب

مسیحی مذہب کی وہ حقیقت معلومہ جس سے اور حقیقتیں مستنبط ہوتی ہیں

اب ہم اُس سوال پر غور کرتے ہیں جو یسوع نے جو دینی معاملات میں لاثانی اُستاد سمجھا جاتا ہے ایک مرتبہ اپنے شاگردوں سے کیا۔ اور جب ہم اُس جواب پر نظر ڈالتے ہیں جو اُس نے اپنے شاگردوں سے پایا اور جس کی نسبت اُس نے یہ کہا کہ میں اپنی کلیسیا اسی پر قایم کروں گا تو ہم پر وہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے جسے وہ مذہب کے حق میں ایک فیصلہ کُن بات اور ایک ایسا موقعہ تصور کرتا تھا جہاں سے مذہبی تحقیقات کو شروع کرنا چاہئے۔ پس جب ہم مذہب کے اہم سوال کو اُسی طرح پیش کرتے ہیں جس طرح یسوعؔ نے اُسے پیش کیا۔ تو نہ صرف ہم مسیحی مذہب ہی کو کامیابی کی اُمید سے ہاتھ لگاتے ہیں بلکہ مذہب کے عام سوال کو بھی بڑی اُمید سے شروع کرتے ہیں کیونکہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مذہب کے مضمون پر کسی شخص کے اقوال یسوعؔ کے اقوال سے زیادہ مستند اور قابل لحاظ نہیں ہیں۔

لیکن جب ہم اُس سوال پر جو یسوع نے کیا تھا غور کرتے ہیں تو ہم متحیر ہو جاتے ہیں۔ ناظرین یہ تو سمجھ گئے ہونگے کہ ہمارا اشارہ اُس نظارہ کی طرف

ہے جو قیصریہ فلپی کے قرب و جوار میں ظاہر ہوا۔ اُسی موقعہ پر یسوؔع نے اپنے شاگردوں سے پوچھا تھا کہ "تم کیا کہتے ہو کہ میں کون ہوں؟" یہ سوال واقعی ایک توجہ طلب سوال ہے۔ پر جس بات سے حیرت آتی ہے وہ یہ ہے کہ یسوؔع نے اُسے ایک بُنیادی اُصول ٹھہرایا۔ عام قاعدہ تو یہ ہے کہ دینی معلم کی ذاتی کیفیت خواہ کیسی ہی دلچسپ کیوں نہ ہو ایسی قابلِ غور نہیں سمجھی جاتی جیسی کہ اُس کے پیغام کی سچائی سمجھی جاتی ہے۔ اور تعجب نہیں کہ یسوؔع کے سامعین بھی یہی سوچتے ہونگے کہ جس سوال کو وہ مذہب کے متعلق فیصلہ کُن سمجھتا ہے وہ شاید علم الٰہی کے کسی بڑے مسئلے سے علاقہ رکھتا ہوگا۔ شاید اُنہیں یہ توقع ہوگی کہ جب وہ ہم سے کوئی سوال کریگا تو وہ غالباً یہ ہوگا "کیا تم آسمانی باپ پر ایمان لاتے ہو؟" یا شاید کسی اخلاقی اصول کی نسبت یہ کہیگا "کیا تم پہاڑی وعظ کی شریعت کو قبول کرتے ہو؟" لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے اِس قسم کا کوئی سوال نہیں کیا۔ اُس کا سوال نہ خدا کی نسبت تھا اور نہ اِخلاق کے بارے میں۔ وہ نہ تھیالوجی (علم الٰہی) سے علاقہ رکھتا تھا اور نہ علم الاخلاق سے۔ اُس کا علاقہ اُسی کی ذات سے تھا اور اُس نے اسی سوال اور اُس کے جواب کی نسبت بڑے جوش و خروش سے یہ فرمایا کہ میں اسی پر اپنی کلیسیا قایم کروں گا۔ اُس کا یہ قول نہایت توجہ کے لایق ہے۔ اور جس قدر ہم اِس قول کے مطلب اور مفہوم کو اچھی طرح اپنے دل پر نقش کر لیتے ہیں اُسی قدر ہمارے لئے مفید ہوتا ہے۔ غور کیجئے کہ وہ شخص جو دینی اُستادوں میں اعلےٰ سمجھا جاتا ہے اپنے مذہب کو اُس تصور پر جو اُسی کی ذات سے علاقہ رکھتا ہے قائم کرتا ہے۔ ہم تو واعظ کی شخصیت کو عموماً مذہب سے بالکل جُدا سمجھا کرتے ہیں۔ لیکن یسوؔع اپنی ہی شخصیت اور ذات کو اپنے مذہب کی

بنیاد ٹھہراتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ وہ لوگوں کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ دین عیسوی کی جان اور حقیقت کیا ہے تو اُس کی تلاش میری ہی ذات میں کرو۔

اگر اس دعوے کی تائید و تصدیق کے لئے اور انجیلی شہادت کی ضرورت ہو تو وہ بھی موجود ہیں۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ اُس کے اِس دعوے کا سُراغ اُس کے کل طریقہ تعلیم میں روز روشن کی طرح عیاں ہے وہ طریقہ ایسا انوکھا ہے کہ ویسا کسی اور دینی اُستاد نے اختیار نہیں کیا۔ آجکل جہاں کہیں صدق دلی سے اِس مضمون پر غور کیا جاتا ہے وہاں یہ بات بالعموم تسلیم کی جاتی ہے کہ انجیل کے بیانات کے مطابق جو خاص بات مسیح کے طرز تعلیم کے متعلق ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یسوع مسیح بار بار اور بڑے زور شور کے ساتھ اپنے شاگردوں کی توجہ اپنی ہی ذات کی طرف کھینچا کرتا تھا۔ ہاں اُس کی تعلیم کا یہ خاصہ ایسا ابھرا ہوا ہے کہ سرسری طور پر پڑھنے والا بھی اُس سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اور اگر وہ اُس کے طرز اور طریقہ کو موسیٰ یا یسعیاہ یا یوحنا بپتسمہ دینے والے کے طریقہ کے ساتھ مقابلہ کرکے دیکھے۔ یا افلاطون کی تصنیفات یا قرآن کے بالمقابل رکھ کر غور کرے تو اُسپر مسیح کی تعلیم کی یہ خاصیت اور بھی زیادہ واضح ہو جائیگی۔ وہ اِن لوگوں کے طریقۂ تعلیم کی یہ خصوصیت مشاہدہ کریگا کہ یہ لوگ اس بات کو خوب محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا کام فقط یہ ہے کہ ہم سچائی کو پیش کرکے بتا دیں کہ سچائی کیا ہے۔ اور وہ یہ بھی دیکھیگا کہ جس قدر کوئی معلم بزرگی کی منزل میں بڑھا ہوا ہوگا اُسی نسبت سے وہ اِس بات کو زیادہ محسوس کریگا۔ پس یہ سب لوگ جنکے نام اوپر مرقوم ہوئے اپنے آپ کو صداقت کے ابدی اصولوں کے سامنے

چھپا لیتے ہیں۔ پر مسیح اور وہی اکیلا رُوح کی رہنمائی کرنے والوں میں ایسا معلم ہے جو اپنے آپ کو اعلےٰ سے اعلےٰ اصولوں کا مرکز قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اُس شخص کو جو ہمیشہ کی زندگی کی تلاش میں تھا یہ کہا "میرے پیچھے آ"۔ اور اُسے جو باپ کو دیکھنا چاہتا تھا یہ فرمایا "کیا تو مجھے نہیں جانتا"۔ کبھی کسی دینی اُستاد نے ایسا کہنے کی جرأت نہیں کی۔ کسی آدمی نے صداقت اور حق کے بارے میں یہ کہا ہے کہ میں صرف حق کی تعلیم ہی دینے نہیں آیا بلکہ میں خود حق ہوں؟ یا کس نے خدا کے دیدار کی نسبت ایسا دعوےٰ کیا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا ہے اُس نے اُسے دیکھا ہے؟ یا کس نے اُن باتوں کی نسبت جو انسان کی ضرورتوں کو رفع کرتی ہیں یعنی دلی آرام روحانی خوراک۔ روحانی طاقت اور گناہوں کی معافی وغیرہ کی نسبت یہ کہا ہے کہ یہ سب چیزیں مجھ میں ملتی ہیں؟ موسیٰؑ نے کبھی ایسا دعوےٰ نہیں کیا اور نہ دیگر انبیاء نے۔ نہ افلاطون اور بدھ اور محمدؐ نے۔ مگر یسوع نے یہ دعوےٰ کیا ہے۔ اور وہ اِس قسم کے دعوے قصدًا اور بار بار کیا کرتا تھا۔ اور کوئی شخص اس بات میں شک نہیں لاتا کہ وہ ایسے دعوے کیا کرتا تھا۔ یہی بات اُس میں اور دیگر مذہبی اُستادوں میں حد فاصل کا کام کرتی ہے۔ دوسرے معلم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم فقط حق کا پیغام دینے والے ہیں مگر وہ نہ صرف پیغامبر ہے بلکہ آپ ہی اپنا پیغام بھی ہے۔ دوسرے دینی اُستاد مشعل بردار ہیں مگر وہ کہتا ہے کہ "میں دُنیا کا نور ہوں"۔ وہ حق کی طرف اشارہ کرکے بتا دیتے ہیں کہ حق کیا ہے۔ مگر یسوع کہتا ہے کہ "تم میرے پاس آؤ"۔ اب یہ سب باتیں یسوع کی تعلیم کے ساتھ خاص ہیں۔ اُس کے شاگردوں کی تربیت کے سلسلہ میں بھی یہ خصوصیت ترتیب

تدریج کے ساتھ قدم بقدم آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے - اور ایسی صفائی کے ساتھ کہ بیدار مغز آدمی فوراً جان لیتا ہے کہ جو گفتگو قیصریہ فلپی کے آس پاس کسی جگہ وقوع میں آئی وہ اتفاقی گفتگو نہ تھی بلکہ وہ اُنکی تربیت کا وہ پھل تھا جس کا اظہار شروع ہی سے ملحوظ خاطر تھا اور یہی سبب تھا کہ وہ جواب جو اُسے شاگردوں کی طرف سے ملا معرفت کا اعلےٰ اظہار سمجھا اور خوشی سے قبول کیا گیا ۔

پس مسیح نے جو دُنیا میں مذہب کی منادی کرنے آیا تھا اس کام کو قصداً اور وضاحتاً اِس طرح انجام دیا کہ لوگوں کو اپنی ہی ذات کی طرف متوجہ کیا اور اُسی پر سوچنے کی ترغیب دی۔ ایک روشنضمیر جرمن کا قول ہے کہ "وہ اس سے بڑھکر اور کسی کام کو زیادہ متبرک نہیں سمجھتا تھا کہ لوگوں کو اپنی شخصیت کی طرف راغب کرے"۔ وہ اس لئے نہیں آیا تھا کہ علم الہٰی کے مسائل کا کوئی سلسلہ قائم کرے یا کسی طرح کے علم الاخلاق کی بُنیاد ڈالے بلکہ اس لئے آیا تھا کہ لوگوں کے دلوں اور عقلوں کے سامنے اپنے آپ کو رکھے۔ پس وہ ہمارے لئے یہ سوال نہیں چھوڑ گیا کہ "تم اس مسئلے یا اُس اصول کی نسبت کیا رائے رکھتے ہو؟" جو سوال وہ ہمارے لئے چھوڑ گیا ہے یہ ہے کہ "تم مسیح کی نسبت کیا کہتے ہو؟"۔ اور جیسا ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اسکا یہی مطلب ہے کہ یسوع ہمیں دین عیسوی کی بُنیادی بات دریافت کرنے کے لئے اپنی ذات کی حقیقت کی طرف راجع کرتا ہے نہ اس بات کی طرف کہ ہم اُسے اُس کی تعلیم یا اُس کے خیالات یا اُس کے نمونہ میں ڈھونڈیں۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اُس کے مذہب کی حقیقت کی تلاش اِسی میں کریں - ایک اور جرمن مصنف جو بڑی خبرداری سے

[illegible]

اِن باتوں کی تحقیق کرنا اور ایک ایسا نکتہ چین سمجھا جاتا ہے جو مسیحی مذہب کی مسلمہ تعلیموں کی طرفداری نہیں کرتا کہتا ہے کہ "مسیح کا مذہب عجیب طور پر مسیح ہی کی شخصیت کی طرف رہنمائی کرتا ہے" اور پھر اس پہ یہ اضافہ کرتا ہے "صرف یہی بات ہمیں اُس مذہب کے سمجھنے کے قابل بناتی ہے جو مسیح میں سے پھوٹ نکلا" اس شخص کے قول کے مطابق مسیحیت کے سمجھنے کے لئے ابتدا میں اِس بات کی ضرورت ہے کہ ہم پہلے مسیح پر غور کریں۔ یا یوں کہیں کہ اِس بات پر غور کریں کہ ہمارا دل اور ہماری ضمیر اُسے کیا سمجھتی ہے۔ جس زمانہ کو "اوف کلارنگ" کہتے ہیں اُس میں فلسفانہ طبعیت کے لوگ مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ دینِ عیسوی عقل کے ازلی اور ابدی اصولوں کا اظہار ہے۔ اور اُن کا یہ قول غلط نہ تھا لیکن اِس زمانہ کے پرکٹیکل یعنی عملی باتوں کو زیادہ پسند کرنے والے لوگ اُسے اخلاقی اعمال کا ایک محرک اور نمونہ تصوّر کرتے ہیں۔ اور یہ بات بھی بالکل صحیح ہے تاہم یہ بات وہ طریقہ نہیں ہے جس کے وسیلے سے مسیح اس مضمون پر غور کرنے کی ہدایت کیا کرتا تھا۔ وہ اُن لوگوں کے سامنے جو مذہب کے مضمون پر غور و فکر کرنا چاہتے تھے وہی سوال رکھا کرتا تھا جو اُس نے قیصریہ فلپی کی نواح میں اپنے شاگردوں کے سامنے رکھا۔ یا یوں کہیں کہ کیا وضاحتاً اور کیا کنایتاً بہر حال لوگوں کی توجہ اپنی ہی طرف کھینچا کرتا تھا۔ اور اِس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وہ مذہب پر تعلیم دینے کے حق میں ایک ایسا اُستاد تھا کہ اُس کا ثانی دُنیا میں اور کوئی نہیں ملتا۔

اب اِس بات سے مذہب کی تحقیق کے کل دائرہ میں ایک عجیب انقلاب

پیدا ہو جاتا ہے ۔ مذہب جس کی تحقیق میں انسانی رُوح جو دیدار خدا کی مشتاق ہے اکثر سرگرداں اور مایوس ہو جاتی ہے ایسے الفاظ ہیں ہمارے سامنے رکھا جاتا ہے جنکو ہم بہ سبب اُنکی سادگی کے مشکل سے کافی سمجھتے ہیں ۔ مگر اس کا سبب یہ ہے کہ جیسا اس بات کو ہمیں مدِ نظر رکھنا چاہیئے تھا کہ ان الفاظ کا کہنے والا کون ہے ہمنے نہیں رکھا ۔ پس جیسا ہمیں مسیح کی بات پر غور کرنا چاہیئے تھا ویسا ہم نے نہیں کیا ۔ پر جیسی ضرورت اسپر غور کرنے کی اب محسوس ہوتی ہے ویسی آگے کبھی نہیں ہوئی ۔

آجکل مذہب کے سوال کے متعلق دو غور طلب اور پُر مطلب باتیں نظر سے گذرتی ہیں اور وہ دونو اسی سوال کے دو جداگانہ پہلوؤں کو ہمارے سامنے لاتی ہیں ۔ اور وہ یہ ہیں کہ ایک طرف تو بے اعتقادی نے اگناسٹی سزم (ذات باری کے علم کے انکار) کی اُبھری ہوئی صورت اختیار کر رکھی ہے ۔ اور دوسری جانب مسیحی مذہب کے پیرو ایسی متحیر اور اختلاف آمیز حالت میں گرفتار ہیں کہ آگے کبھی ایسی حالت اُنپر طاری نہیں ہوئی تھی ۔ اور یہ تحیر اور اختلاف اِس بات کی تحقیق اور تجسس کے سبب سے پیدا ہوا ہے کہ مسیحی مذہب اصل میں کیا ہے ۔ اگر ہم ان باتوں پر تھوڑی دیر کے لئے غور کریں تو ہمپر یہ بات ظاہر ہو جائیگی کہ یہ دونوں حالتیں اِس سبب سے پیدا ہوئی ہیں کہ لوگوں نے مسیحی مذہب پر اُس طرح غور نہیں کیا جس طرح کہ اُس کے بانی نے اُس پر غور کرنے کی ہدایت کی تھی ٭

عدم اعتقادی نے جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اگناسٹی سزم کی صورت اختیار کر رکھی ہے ۔ ہم آجکل والٹیر کے زمانہ میں نہیں ہیں ۔ اور نہ اُن لوگوں کے زمانہ میں ہیں جو ڈی اِسٹ کہلاتے تھے ۔ چنانچہ آجکل

شاذ ہی کوئی شیفٹس بری - ٹولنڈ یا بولنگ بروک کی کتابیں پڑھتا ہے -
اُنکا زمانہ گذر گیا - اور نہ کوئی اور ہی مذہب آجکل ایسا دکھائی دیتا ہے
بشرطیکہ یہ بات فیصل ہو جائے کہ ہمیں مذہب کی ضرورت ہے جو مسیح کے
مذہب کا ہمسر ہو - البتہ کبھی کبھی نیو بدہ زرم (neo Budhism)
جیسے مذہب کی نسبت کچھ چرچا کیا جاتا ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم
کے مذاہب کی نسبت باتیں تو بہت کیجاتی ہیں مگر اُنکی پیروی بہت کم ہوتی
ہے - تاہم اس دعوے سے کہ ہم فلاں یا فلاں زمانہ میں نہیں ہیں اور کہ
مسیحی مذہب کا ہمسر اور کوئی مذہب نہیں ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہمارے
زمانہ کے لوگ مسیحی مذہب کی صداقت کے قائل ہو گئے ہیں - بلکہ برعکس اسکے
یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحی مذہب سے زیادہ تر کنارہ کشی کیجاتی ہے - ہم یاد
رکھیں کہ وہ مخالف جو یہ دعوے کرتے ہیں کہ دین عیسوی جھوٹا ہے مغلوب
کئے جا سکتے ہیں خواہ وہ کیسے ہی زبردست کیوں نہ ہوں - لیکن جو انکار
یہ استدلال کرتا ہے کہ چونکہ مذہب کی حقیقت انسان کے حیطۂ دریافت سے
باہر ہے لہذا دین عیسوی کے دعوے ہیچ ہیں پہلی قسم کی مخالفت کی نسبت
زیادہ سخت اور خطرناک ہے - خواہ اُس کا اظہار ملائم سے ملائم الفاظ میں
کیوں نہ کیا جائے - اور ہمارے زمانہ کے بہت لوگوں کے خیالات نے
اسی انکار کی صورت اختیار کر رکھی ہے - اور لوگ تندی اور تیزی سے
اُسے ظاہر نہیں کرتے - اُن میں سے بعض یہ بھی چاہتے ہیں اور
دل و جان سے چاہتے ہیں کہ ایمان لائیں لیکن ایمان نہیں لا سکتے کیونکہ
اگناسٹک ہو گئے ہیں - یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ مذہب کی
حقیقت کیا ہے اور نہ کوئی اور یقینی طور پر اُس کی حقیقت سے واقف

ہے۔ جیسا سقراط کے زمانہ میں تھا ویسا ہی آج بھی مذہب محض "سنہری ابہدوں کی ایک چیز" سمجھا جاتا ہے۔ ہاں وہ ایک ایسی شئے تصور کیا جاتا ہے جو ہم سے دور ہے۔ جس کی حقیقت کا یقین اور علم پختہ طور پر کسی کو حاصل نہیں اور نہ ہی غالباً ہو سکتا ہے۔ ہم اِس جگہ اگناسٹی سزم کے کسی خاص پیرائے کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ بلکہ اُس عام متذبذب حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں کئی سمجھدار مرد اور عورت مذہب کے سوال کے متعلق گرفتار ہو رہے ہیں۔ یہ حالت اِس قسم کے لوگوں کے درمیان دیکھنے میں آتی ہے۔ لیکن اِس میں یہ خطرناک بات پائی جاتی ہے کہ جب ایمان کافور ہو جاتا ہے تو بہت سے لوگ حالانکہ برعکس نظیریں بھی موجود ہوتی ہیں کاملیت کے لیئے محض اخلاقی کوشش کو کافی سمجھنے کے خطرے میں گرفتار ہو جاتے ہیں؛

لیکن سوال یہ ہے کہ اِس بے یقینی اور اگناسٹی سزم کا باعث کیا ہے؟ ہماری رائے میں اِس کا سبب یہ ہے کہ لوگ اب اِس بات کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگ گئے ہیں کہ اُن سوالات کا جو خدا اور رُوح کی نسبت کئے جاتے ہیں جواب دینا مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ عالمِ موجودات کی اصل اور غرض ایسی بعید الفہم اور بیروں از قیاس ہے اور اِسی طرح زندگی بھی ایسی پیچ در پیچ شے ہے کہ ہم ان باتوں کی نسبت مذہبی صورت میں بہت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم فطرت کے اظہاروں سے تو واقف ہیں اور وہ ایسے کثیر اور وسیع بھی ہیں کہ ہمیں لامحدود تک لیجاتے ہیں پر ہم یہ نہیں جانتے کہ جہاں وہ ختم ہوتے ہیں وہاں اُنپر کیا وارد ہوتا ہے۔ پس ایمان اور بےاعتقادی کی باہمی جنگ ٹنڈل اور پیلے جیسے بزرگوں کے برپا ہونے کے باوجود بھی

ناممکل حالت میں رہی - اور اب تو یہ مشکل اگلے زمانوں کی نسبت بھی زیادہ
بڑھگئی ہے - یعنی لوگ خدا اور مکاشفے اور مخلصی اور غیر فانیت کے بارے
میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ یہ سب امور حقیقی ہیں - یہ باتیں ہماری سمائی
سے باہر ہیں ؟ کون انکی تہ تک پہنچ سکتا ہے ؟ اِس قسم کے لوگوں میں
جو زیادہ سنجیدہ مزاج ہیں وہ ہربرٹ سپنسر کی کتابیں پڑھتے اور اپنی اگناسٹی سزم
کو فلسفہ کی صورت میں ڈھالتے جاتے ہیں اور جو تنک ظرف ہیں وہ عمر خیام
کی تصنیفیں پڑھتے اور عیاش زندگی بسر کرتے ہیں اور کئی ایسے محقق بھی ہیں
جو آرام دلی کے جویاں تو ہیں مگر اس سبب سے کہ دل کا آرام دستیاب نہیں
ہوتا بے تسلی پڑے ہیں ؀

اب اِس قسم کے لوگوں کے پاس خواہ اُنکی اگناسٹی سزم اپنے
آپ کو عقلاً کافی سمجھتی ہو یا وہ عیاشی میں پناہ گزین ہو یا وہ برخلاف
اِن ہر دو حالتوں کے "تاسف کی حالت میں مبتلا ہو بہرکیف روحوں کا
اُستاد ایسے لوگوں کے پاس آتا اور اُن کے سامنے مذہب کے سوال
کا وہ نیا پہلو جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا رکھدیتا ہے - گویا یہ کہتا
ہے "تم کہتے ہو کہ ہم اُس عظیم سوال کا جو خدا کی ہستی سے علاقہ رکھتا ہے
جواب نہیں دے سکتے - کیونکہ اُس کی ہستی اور صفات ہماری سمجھ سے
باہر ہیں - لیکن میں تمہارے سامنے ایک اور طریقہ رکھتا ہوں جس کے
وسیلے سے تم اِس سوال کا جواب دے سکوگے - اور وہ یہ ہے کہ
میں تم سے پوچھتا ہوں کہ "تم میری نسبت کیا کہتے ہو" ؟ اس سوال میں
اور باتیں بھی پائی جاتی ہونگی مگر اتنی بات اس کی نسبت صاف ظاہر ہے
کہ یہ سوال لاجواب نہیں ہے - اس کا جواب دیا جا سکتا ہے - اور

تمہاری اگناسٹی سزم (لاعلمی) اِس پر چسپاں نہیں ہوسکتی۔ خدا کی ہستی تمہاری سمجھ سے باہر ہو تو ہو۔ پر حقیقت المسیح تمہاری سمجھ سے باہر نہیں ہے کیونکہ مسیح تو ایک تواریخی حقیقت ہے اور جس طرح کوئی اور تواریخی واقعہ یا ظہور جانا جاسکتا ہے اُسی طرح یسُوع کی حقیقت بھی جانی جاسکتی ہے۔ اور جو نتائج تم اِس سوال کی تحقیق میں جس کا جواب پانا ناممکن نہیں ہے جمع کروگے وہی مذہب کے مشکل سوال کے جواب کا شروع ہونگے!!

اب ظاہر ہے کہ یسُوع مذہب کے معاملے کو ایسی صورت میں پیش کرتا ہے کہ اُس کا سمجھنا اور جواب دینا ناممکن معلوم نہیں ہوتا۔ وہ اُسے چھپی ہوئی کوٹھڑیوں سے نکالکر منصۂ شہود پر بٹھا دیتا ہے۔ دینِ عیسوی اگناسٹی سزم کو مسیح کے قول کے مطابق ہی جواب دیتا ہے۔ جی۔ ایچ لوئس اپنی کتاب موسومہ "ہسٹری آف فلاسفی" میں مذہب کو اُن چیزوں میں سے خارج کردیتا ہے جنکا علم محک امتحان کے وسیلے آزمایا جاسکتا ہے اور اِس کی یہ دلیل دیتا ہے کہ "مذہب اپنی اس ناقابلیت کا آپ ہی مقر ہے۔ چنانچہ وہ مذہبی علم کے لئے کوئی ایسی بنیاد پیش نہیں کرسکتا جو انسان کی رسائی کے اندر ہو" لیکن ہم کہتے ہیں کہ مسیح کے طریقۂ تعلیم کے مطابق یہ اعتراض مسیحی مذہب پر عائد نہیں ہوسکتا کیونکہ اُس نے اپنے شاگردوں کے سامنے ایک ایسے نہایت مضبوط بنیادی اُصول کو رکھا جو اُنکی سمجھ سے ہرگز ہرگز باہر نہ تھا۔ اور وہ بُنیادی حقیقت وہ خود آپ ہی تھا۔ پس اُس کے مذہب کا بُنیادی اُصول ایک حقیقت واقعی میں پایا جاتا ہے۔ اور وہ کیا ہے؟ کیا وہ ایسے تصورات یا خیالات ہیں جو مذہب کے نامعلوم کرہ میں پرواز کررہے ہیں؟ نہیں۔ "تم کیا کہتے ہو کہ میں کون ہوں؟" "تم مسیح کی نسبت کیا خیال کرتے ہو؟" "میں

حق ہوں۔ تم میرے پاس آؤ"۔ یہ ہیں وہ باتیں جن میں دین عیسوی کی بنیادیں قائم ہیں۔ یا یوں کہو کہ وہ ایک تواریخی شخص میں قائم ہیں جو ایسا ہی قابلِ تحقیق و فہم ہے جیسا کوئی اور تواریخی واقعہ ہوتا ہے۔ پس مسیح نے اگناسٹی سزم کا منہ بند کر دیا جب اُس نے یہ ظاہر فرمایا کہ مذہب کی بنیاد حقیقت المسیح میں موجود ہے ؛

پر اِس دعوے سے کہ مسیح نے اگناسٹی سزم کا منہ بند کر دیا یہ نتیجہ فی الفور نہیں نکلتا کہ اُس نے اُسے شکست دیکر چکنا چور کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ہم صدق دلی اور دیانت کے ساتھ حقیقت المسیح پر غور کریں اور پھر بھی مذہب کے وجود کے قائل نہ ہوں۔ اِس بات پر پھر غور کیا جائیگا فی الحال یہ سوال درپیش ہے کہ جو لوگ اگناسٹک ہو گئے ہیں اِن میں سے کتنوں نے اِس طریقہ کو آزما دیکھا ہے؟ ہمارا مطلب یہ ہے کہ کتنے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے فی الواقع اپنے دِلوں اور ضمیروں کی صفائی سے حقیقت المسیح پر نظر کی اور اِس بات پر صدق دِلی سے غور کیا کہ مذہب کی حقیقت کو منکشف کرنے میں یہ بات کہانتک ہماری مدد کر سکتی ہے؟۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی شخص کو اختیار نہیں کہ وہ اگناسٹک بنے۔ تو بھی اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کسی شخص کو اگناسٹک نہیں بننا چاہیئے جب تک وہ اُس سوال کی چھان بین نہ کرلے جو مسیح کی نظر میں مذہب کے متعلق فیصلہ کن تھا۔ اور یقیناً وہ ایسا سوال نہیں ہے کہ جس کا جواب نہ دیا جا سکے۔ پس مناسب ہے کہ ہم مذہب کی تحقیق کو نہ چھوڑیں جب تک کہ ہم پر یہ بات روشن نہ ہو جائے کہ جو طریقہ مذہب کے سب سے اعلےٰ اُستاد نے بتایا ہے وہ بھی اِس معاملے کی تحقیق میں کسی طرح کی مدد نہیں دیتا۔ اور پھر یہ بھی ہوگا کہ اگر ہم حقیقت میں اِس

مشکل کو حل کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس تحقیق کو یک بیک ترک نہیں کریں گے پس اگر کوئی شخص اس معاملے میں دیانتدار بننا چاہے تو اُس کا فرض ہے کہ کچھ عرصہ تک سنجیدگی کے ساتھ قیصریہ فلپی میں رہے۔ یعنی اُس سوال پر غور کرے جو قیصریہ فلپی میں مسیح نے پوچھا تھا اور پھر اگر اگناسٹک بن سکے تو بنے ؛

اب جس طرح وہ طریقہ جس سے مسیح نے مذہب کے سوال کو روشن کیا اگناسٹک میلان سے جو ہمارے زمانہ کے لوگوں کی طبعیت کا ایک اُبھرا ہوا نشان ہے ایک خاص علاقہ رکھتا ہے اُسی طرح وہ مذہب کے دوسرے پہلو سے بھی جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں علاقہ رکھتا ہے۔ آجکل اہل تحقیق کے لیئے یہی ایک مشکل نہیں کہ وہ کس طرح مسیحی مذہب پر ایمان لائیں ایک اور مشکل بھی درپیش ہے اور وہ شاید ایمان لانے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بھی دریافت کرنا پڑتا ہے کہ جسے مسیحی مذہب کہتے ہیں وہ دراصل ہے کیا۔ کیونکہ مسیحیوں کے درمیان طرح طرح کے مسیحی مذہب مروّج ہیں اور یہ بتانا کہ مسیحی مذہب درحقیقت کیا ہے اُنیسویں صدی کی مشکلات میں سے ایک بھاری مشکل ہے۔ اور اِس امر کی تصدیق ہر جانب سے ہوتی ہے کیونکہ اِس امر کا چرچا کلیسیا کے اندر بھی اور باہر بھی موجود ہے ؛

جب ہم کلیسیا کے احاطہ کے باہر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ میلان اُس نکتہ چینی میں دکھائی دیتا ہے جس میں سے مسیحی مذہب ان دِنوں گذر رہا ہے۔ اور وہ نکتہ چینی نکتہ چینیوں کی رائے میں مذہب کی عمارت کو مسمار کرنے والی نہیں بلکہ اُسے ازسرِ نو تعمیر کرنے والی ہے۔ کم از کم اُس کا دعوےٰ یہی ہے۔ بہ تبدیل الفاظ یوں کہیں کہ اُس کی غرض یہ نہیں کہ

مسیحی مذہب نابود ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ نابود ہونے سے بچایا جائے۔ پس یہ نکتہ چینی اِس مقصد سے نہیں کیجاتی کہ دین نیست ہو جائے بلکہ اس مقصد سے کیجاتی ہے کہ وہ نیست کرنے والی طاقتوں سے رہا کیا جائے۔ یعنی یہ نکتہ چینی یہ چاہتی ہے کہ ہمیں وہ سچا اور سادا اور خالص مسیحی مذہب مل جائے جس کی جگہ اُس روائتی مذہب نے لے لی ہے جو صدیوں سے تاریکی میں ملفوف اور غلطی سے بھرپور چلا آتا ہے۔ لہذا اُس کا (یعنی زمانہ حال کی نکتہ چینی کا) یہ دعوے ہے کہ مسیحی مذہب کو ابھی پیدا ہونا ہے یا یوں کہیں کہ ابھی ازسرنو پیدا ہونا ہے۔ پس یہ نکتہ چینی اِس واسطے برپا ہوئی ہے کہ اُسے ازسرنو پیدا ہوتے دیکھے کیونکہ اُس کے زعم میں جب وہ پہلی دفعہ پیدا ہوا تھا اُس وقت گہوارے ہی میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا تھا۔ اب اِسی غرض اور نیت سے وہ کتابیں لکھی گئی ہیں جنکے نام "لٹریچر اینڈ ڈاگما" (علم ادب اور عقائد) اور "رابرٹ ایلسمیر" ہیں۔ انکے مصنف دعوے کرتے ہیں کہ یہ کتابیں اِسی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ اور ہم انہیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں ؛

پر ہمیں یقین ہے کہ ہمارا قول گستاخی نہیں سمجھا جائیگا اگر ہم یہ کہیں کہ جو شخص تواریخی باتوں کے سمجھنے کا کچھ بھی سنجیدہ مذاق رکھتا ہوگا اُسے ایسے دعوے کرنیوالوں میں کچھ کچھ انوکھی عقل کی بلند پروازی نظر آئیگی۔ کیونکہ یہ کہنا کہ مسیحی مذہب کی عمارت جو صدیوں سے کھڑی ہے مسمار ہو کر پھر ازسرنو وسعت کے ساتھ تعمیر کیجائے۔ اور یہ دعوے کرنا کہ چونکہ اُس کا اصل مطلب زائل ہو گیا ہے لہذا اُس کے پھر بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ بتانا کہ جو بنیاد مقدس یوحنا اور مقدس پولوس نے اور اتھنیس اور اگستن اور لوتھر نے رکھی تھی وہ تو مغالطہ میں ڈالنے والی ہے۔ لہذا اِس بات کی ضرورت ہے کہ اب پھر ایک نیا راستہ تیار کیا جائے۔ ایسے دعوے کرنا گویا اُس

آدمی کے فلسفہ کی مانند تواریخی پشت وپناہ سے خالی ہے جو اتفاق سے کھودتے کھودتے مٹی کے تیل کے چشمہ تک پہنچکر یکدم دولتمند ہوجاتا ہے۔ اِن نکتہ چینیوں کی باتیں سُن کر بے ساختہ یہ کلمات زبان سے نکل پڑتے ہیں۔ افسوس صد افسوس! کہ گذشتہ انیس صدیاں کیسی غلطی میں مبتلا رہیں! رسول ہم کو کسی غلط راہ پر ڈال گئے! ہم اُن مسافروں کی مانند ہیں جنکی ٹرین ریل پر سے گر کر ٹھہر جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ مقدّس یوحنّا کو جو بخیال نکتہ چینیاں دینِ عیسوی اُپنے اُستاد سے کہیں بڑھ چڑھ کر علوم مابعد الطبیعت سے واقف تھا" یہ اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اُستاد کے بارے میں اپنا قلم اُٹھائے۔ یا پولوس رسول جیسے ہوا خواہان عقل "مسیحیت کا موجد" کہا کرتے تھے مسیحی مذہب کی تاریخ میں عین اُس وقت نمودار ہو جبکہ وہ مذہب سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہئیے کہ ہمیں کیسا شکر گذار ہونا چاہئیے کہ اب آخرکار "لٹریچر اینڈ ڈاگما" کے مصنف جیسا ایک لائق اور راست گو شخص برپا ہوگیا ہے جو رسولوں کو بھی اور ہمیں بھی راہ راست پر لے آئیگا۔ اور "رابرٹ ایلسمیر" کی مصنفہ جیسی ایک دانا اور سرگرم عورت پیدا ہوگئی ہے جس نے ہمیں بڑے دلچسپ اور نہایت آسان طریقہ سے (یعنی ایک قیاسی ناول میں) صرف آدھ گھنٹے کی بات چیت میں یہ دکھا دیا کہ مسیحی مذہب کی پُرانی صورت کیسی بے تاثیر ہے مگر اس کی نئی صورت (اور یہ بھی اُسی قیاسی ناول میں دکھایا گیا ہے) ایسٹ لنڈن میں کیا ہی زندگی کو نیا بنانے والی ثابت ہوئی ہے۔ اب ہم یہ تو مانتے ہیں کہ مسیحی مذہب کی یہ نئی صورتیں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہنچا رہی ہیں کیونکہ کلیسیا ہمیشہ اس خطرے میں مبتلا رہی ہے کہ کسی قدیم بزرگ کی کتاب کے کسی اقتباس یا اُس کے کسی اقرار کو

سچائی کے متعلق فیصلہ کُن سمجھ بیٹھے۔ پر تو بھی یہ کہنا لازمی امر ہے کہ مسیحی مذہب کی تاریخ کے ساتھ ایسا ہلکا سلوک کرنا درست نہیں ہے ؂

اِس میں شک نہیں کہ مسیحی مذہب کی نئی نئی صورتیں جو اُس کے صحیح اور سادے مطلب کو ظاہر کرنے کا دعوےٰ کرتی ہیں اور جو ایک دلچسپ طور پر مروّج ہوگئی ہیں اِس بات کو ثابت کر رہی ہیں کہ ابھی تک یہ بات پختہ طور پر معلوم نہیں ہوئی کہ مسیحی مذہب کیا ہے۔ اور کہ ہم اُس روائتی بیان کو جو اُس کے متعلق ہمارے زمانہ تک پہُنچا ہے کہانتک اصل سمجھ کر تسلیم کریں یہ بات ہمارے زمانہ کا ایک عجیب خاصہ ہے۔ اور اُس میں یہ عام خیال گونج رہا ہے کہ گو مسیحی مذہب کی تحقیق تو گذرے اٹھارہ سو سال کے اندر برابر ہوتی ہی ہے لیکن مسیح کے مذہب کی تحقیق کرنا ابھی باقی ہے۔ ہاں اِس زمانہ کی بہت بڑی مروّجہ نکتہ چینی اسی بات کی ایک کوشش ہے کہ کہیں اِس سوال کا کہ مسیح کا مذہب کیا ہے ایک سادا اور خالص جواب مِل جائے ؂

جب ہم اغیار کے حدود سے نِکلکر کلیسیا کے احاطہ میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں بھی اِس سوال کا جواب دینا آسان نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہماری مشکل اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے یعنی کلیسیا کے دائرہ میں آکر محقق طرح طرح کی صدائیں سُنتا ہے اور اور بھی حیران ہوجاتا ہے۔ یہ خیال کہ دنیا اِس مشکل سوال کے متعلق دو حصّوں میں تقسیم ہو رہی ہے کہ مسیحی مذہب برحق ہے یا نہیں اِس قدر حیرت افزا نہیں ہے جس قدر یہ بات ہے کہ مسیحی مذہب کے رہنما خود اِس کھلے اور آسان سوال کی نسبت مختلف فرقوں اور طریقوں میں منقسم ہو رہے ہیں۔ مثلاً اگر ایک فرقہ کلیسائی رسوم پر زور دیتا ہے تو دوسرا تعلیمات پر زور دیتا ہے۔ اگر ایک انسان کی اخلاقی رفتار کو ضروری بات

سمجھتا ہے تو دوسرا ایمان کے باطنی تجربہ یعنی نئی پیدائش کی اپنے سارے زور سے تائید کرتا ہے۔ اگر ایک اُستاد بپتسمہ کی بابت پوچھتا ہے تو دوسرا کنورشن کی نسبت سوال کرتا ہے۔ اگر ایک خصوصیت کے ساتھ مسیح کی موت پر سبق دیتا ہے تو دوسرا ویسی ہی تخصیص کے ساتھ نئی زندگی پر زور دیتا ہے۔ اور قباحت یہ ہے کہ یہ مختلف ہادی اِن سب باتوں کو ایک ہی سچائی کے متفرق پہلو نہیں مانتے بلکہ برعکس اس کے قصداً ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ فتوےٰ کہ "جو ایمان نہیں لاتا اُس پر سزا کا حکم ہوگا" سُنایا جاتا ہے صاف صاف انہیں لفظوں میں تو نہیں مگر اور صورتوں میں سنایا جاتا ہے۔ اور جیسی اُس کی صورتیں مختلف ہیں ویسے ہی اُس کا علم بھی ہرکس و ناکس کو حاصل ہے۔ پر اگر یہ سوال کیا جائے کہ کس بات پر ایمان نہ لانے کے سبب سے سزا کا حکم ہوگا؟ تو جواب یہ ملتا ہے کہ کلیسا کے اختیار۔ یا سکرمینٹوں کی ضرورت یا مروّجہ عقیدوں کے اظہار و اقرار یا کفارے کی تعلیم یا رُوح کے وسیلے نیا جنم پانے یا اخلاقی زندگی کی عظمت کو محسوس کرنے کی ضرورت پر ایمان نہ لانے کے سبب سے سزا کے حکم کا فتوےٰ سُنایا جاتا ہے۔ پر اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیوں کے اپنے ہی گھر میں مسیحی مذہب کی سادہ باتوں کے متعلق لفظی تکرار پیدا ہو رہی ہے۔ اور یہ بات اور کسی جگہ ایسی وضاحت سے نظر نہیں آتی جیسی اُس بھاری اور کہنہ جنگ میں نظر آتی ہے۔ جو ایمان اور انکار میں ہو رہی ہے۔ اُمید تو یہ تھی کہ انکار جیسے عدو پر جو سب مسیحی فرقوں کا مخالف ہے سب مسیحی مِلکر حملہ آور ہونگے اور اُن باتوں میں جو فی الحقیقت اُنکے بچاؤ کی باتیں ہیں سب کے سب اپنی طاقتوں کو ایک جا منجمد کرکے ایک جان ہو جائینگے۔ لیکن حالت بالکل دگرگوں نظر آتی

ہے - چنانچہ ایک حصہ کلیسا کا دوسرے حصہ پر یہ الزام لگاتا ہے کہ اُسنے
مغز کو پوست میں تبدیل کر دیا ہے اور وہ اُلٹ کر اُس پر یہ الزام لگاتا
ہے کہ اُس نے پوست کو کھو کر مغز کو ضائع کر دیا ہے - پر اگر کلیسا کی غلطی
سے آزاد ہونے کا عقیدہ مفقود ہو جائے تو کیا اُس کے ساتھ مسیحی مذہب
بھی مفقود ہو جائیگا ؟ کیا بائبل کی غلطی سے محفوظ ہونے کے اعتقاد کے
ساتھ یا دیگر عقائد و مسائل یا معجزات یا فضل کی تعلیمات کے اُٹھ جانے
سے مسیحی مذہب بھی معدوم ہو جائیگا ؟ مسیحی ان سوالوں کے جواب میں
ہاں بھی کہتے ہیں اور نہیں بھی کہتے ہیں - مگر یہ پیچیدگی سادہ خیال آدمیوں
کے لئے جو لڑائی کے شور و غل میں اِتنا نہیں جانتے کہ ہمیں خدا کے
صندوق کے لئے کانپنا چاہئے یا نہیں چاہئے بڑی حیرانی کا باعث ہے
اور اِسی قسم کی پریشانی دین عیسوی کے پُرجوش مخالفوں کو اُس وقت
لاحق ہوتی ہے جبکہ اُن کو یہ کہا جاتا ہے کہ جس بات پر تم نے اپنے
سارے زور سے حملہ کیا ہے وہ تو مباحثہ کے میدان میں داخل ہی
نہیں اور اِس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو کسی شخص نے یوں بیان کیا ہے
کہ جہاں ناواقف فوجیں رات کے وقت ٹکراتی ہیں وہاں لڑنے اور بھاگنے
کی ابتری پیدا کرنے والے اندیشے پیدا ہوتے ہیں - اُسی طرح اِس قسم کی
دینی لڑائی میں بھی لغو جھگڑے اور جھوٹی شکستیں اور لایعنی فتحیں وجود میں
آتی ہیں - دیکھئے مسیحی مذہب کے مباحثہ کے دفتروں میں اِس بات کی کتنی
مثالیں اور نظیریں ملتی ہیں - ناممکن نہیں کہ کبھی کبھی یہ جنگ عقلی طور پر
یا کسی اور صورت میں عظیم الشان دکھائی دی ہو - لیکن اکثر اوقات بہت
سی خرابی کا باعث ہوئی ہے - لیکن اسے جنگ نہیں کہتے - ہاں اِس

طریقے کو سچائی اور جھوٹ - نور اور تاریکی - ایمان اور بے ایمانی کی جنگ نہیں کہہ سکتے ؛

لیکن اِس تمام ابتری کی حالت میں یسوع کی آواز جبکہ وہ قیصریہ فلپی والا سوال پوچھتا ہے - ہمارے کانوں میں ایک عجیب مطلب کے ساتھ آتی ہے - یعنی وہ لوگوں کے نئے بیانوں اور مسیحی مذہب کی نئی ساختوں کے درمیان یہ کہتا ہوا سنائی دیتا ہے " دیکھو اصل سوال جو توجہ طلب ہے یہ ہے - تم میری نسبت کیا کہتے ہو ؟ تمہارا رُخ میری طرف کیسا ہے ؟ نہ نکتہ چینی اِن سوالوں کو معدوم کر سکتی ہے - اور نہ کلیسا اُنپر خاک ڈال سکتی ہے - سو اگر تم حقیقی مسیحیت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اُسے مجھ میں ڈھونڈو جو کچھ میں تمہاری عقل اور دل اور ضمیر کے لئے ہوں - اُسی میں مسیحیت کی تلاش کرو " اس طرح یسوع ہمارے ساتھ ہمکلام ہوتا ہے - اور اُس کی یہ ہدایت ہر نہج ماننے کے قابل ہے - وہ ہمارے لئے آخری سند ہے - کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص یسوع کی مسیحیت کو بدلنا نہیں چاہتا اُس کی یہ ہدایت بڑی وضاحت سے اور براہ راست اپیل کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے - اور عقلی اور اخلاقی دلچسپی سے معمور ہے - اِس طرح ہمارا خداوند اپنے سوال کے وسیلے جس طرح کسی اگناسٹک کے لئے مذہب کے سوال کو ممکن التحقیق بنا دیتا ہے اُسی طرح اُسے متلاشئے حق کے واسطے آسان اور صاف کر دیتا ہے - مگر اِس آسانی اور صفائی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اُسے اُس کے ہر راز سے واقف کر دیتا ہے - مطلب یہ ہے کہ ہم اُس کی نسبت غلط فہمی کے خطرے میں گرفتار نہیں ہوتے اور نہ اُس کو اُلجھنوں میں ڈالتے ہیں - اِس سوال کے وسیلے سے محقق

کم از کم ایک حقیقت معلومہ سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے اور پھر اپنے سلسلۂ تحقیق کو وہاں سے شروع کر سکتا ہے ۔ گو وہ یہ نہیں جانتا کہ مسیحیت کیا ہے تو بھی کم از کم اتنا جان جاتا ہے کہ وہ کہاں ہے ۔ کم از کم اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ اس دریا کا چشمہ کہاں ہے ۔ وہ اُن طرح طرح کی بناوٹی مسیحیتوں کے درمیان جو اُس کے چاروں طرف پھیل رہی ہیں بھوکا اور حیران بلکہ متنفر ہو کر اُن پہاڑوں کی طرف اپنی آنکھ اُٹھاتا ہے جہاں مسیحی مذہب کے دریا کا منبع پایا جاتا ہے ۔ وہ کسی فلسفہ یا علم الٰہی یا اخلاق کے کسی طریقہ سے شروع نہیں ہوا اور نہ کسی کلیسائی تجویز سے یا سوشل یا پولیٹکل تحریک سے پیدا ہوا ہے ۔ وہ اُن لوگوں سے شروع ہوا جنہوں نے ایک عجیب ظہور کا مشاہدہ کیا اور وہ ظہور یسُوع مسیح کی شخصیت کا ظہور تھا ۔ اور اُسی میں لاریب مسیحی مذہب کی عمارت کا وہ مصالح جس سے وہ عمارت مشتمل ہے پایا جاتا ہے ۔ خواہ ہم اِس عمارت کی نسبت کچھ ہی کہیں اس میں شک نہیں کہ مسیحی مذہب کی عمارت کا مصالح اور جائے وقوع اِسی بات میں پائی جاتی ہے ؎

ہر ایک امر کی تحقیق کے متعلق پہلی بات غور طلب یہ ہوتی ہے کہ وہ کس چیز سے مشتمل ہے یا کونسی باتوں پر مبنی ہے ۔ اب یسُوع مسیح کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن باتوں سے مسیحی مذہب مشتمل ہے اُنکی تلاش اُسی کی ذات میں کرنی چاہئے ۔ پس اگر ہم یسُوع کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیں تو مناسب ہے کہ ہم اپنی تحقیق کو اسی اصل بات سے شروع کریں ۔ ہم اپنی تحقیق کو علم الٰہی کے تصوّرات یا اخلاقی نصائح سے شروع نہ کریں ۔ بلکہ ایک حقیقت سے شروع کریں اور وہ حقیقت حقیقتِ مسیح ہے ۔ چاہئے

کہ ہم اس حقیقت کا امتحان کریں اور یہ دریافت کریں کہ وہ کیا ہے اور اُس کا کیا مطلب ہے۔ یہی طریقہ ہے جس سے ہم مسیحی مذہب کو اُس کی درست اور صاف اور سادہ صورت میں دیکھ سکتے ہیں اور ساتھ ہی مذہب کے عام سوال پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ مسیحی مذہب کی بنیادی باتیں مسیح کی ذاتی حقیقت میں پائی جاتی ہیں ؀

اب یہ بات لفظوں میں تو تسلی بخش معلوم ہوتی ہے مگر اس کے متعلق ایک بھاری سوال بھی پیدا ہوتا ہے جو مذکورۂ بالا سوال کے تمام مذہبی مطلب کو زائل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے۔ کیا مسیح کی زندگی کی حقیقت ایک ایسی حقیقت نہیں ہے جو اُنیس سو سال کی عمر رکھتی ہے۔ جو انیس صدیاں گذریں کہ ظہور میں آئی۔ جو لوگ اُس وقت موجود تھے ممکن ہے کہ یسوؔع نے اُن کے سامنے اپنے آپ کو مذکورۂ بالا صورت میں پیش کیا اور یوں وہ اُنہی کے لئے ایک خاص طرح کا مذہبی مطلب یا فائدہ رکھتا تھا۔ مگر ہمارے لئے اِتنی پُرانی بات آج کیا فائدہ رکھ سکتی ہے ! اُس شخص سے جس کو گذرے ہوئے صد ہا سال ہو گئیں خواہ وہ کیسا ہی عجیب کیوں نہ ہو ہمیں کب کسی طرح کا حقیقی اور سچا مذہبی فائدہ پہنچ سکتا ہے ! کیونکہ مذہب کو تو اُن روحانی حقیقتوں کی ضرورت ہوتی ہے جو فی الحال موجود اور تازہ ہوں۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی حقیقتیں یسوؔع کی تعلیم میں موجود ہوں۔ لہذا ممکن ہے کہ ہمیں اُس کی تعلیم میں وہ چیز دستیاب ہو جس سے مذہب پیدا ہوتا ہے۔ پر کیا خود یسوؔع پر اتنا زور دینا حقیقت میں بذاتِ خود مذہب کا ایک حصہ ہے۔ مذہب جو کہ نہ کسی تاریخی اور نہ کسی تھیولاجیکل اور نہ اخلاقی رائے کا نام ہے کیونکہ اپنا اصل

اصول حقیقت مسیح میں رکھ سکتا ہے؟ گو شاگردوں نے اپنے مذہب کو اس پر قائم کیا اور گو وہ ایسا کرسکے مگر ہم کہاں کرسکتے ہیں ہم نہیں کرسکتے۔ اگرچہ ایسا نہ کرنا ہماری بدقسمتی سمجھا جائے۔ پر کیا کریں یہ بدقسمتی ایسی ہے کہ اس سے کنارہ کشی نہیں ہوسکتی۔ مسیح کی حقیقت کا استحان ہمیں تواریخی اور دیگر نتائج تک پہنچائے تو پہنچائے مگر مذہب تک کیونکر پہنچا سکتا ہے کیونکہ مذہب کی حقیقت روحانی زندگی کی اُن ازلی صداقتوں سے مشتمل ہوتی ہے جواب روح میں موجود اور زندہ ہوں اِس طرح کا سوال کیا جاسکتا ہے؛

اِس سوال کا پختہ اور مستند اظہار اُن خیالوں میں پایا جاتا ہے۔ جنپر ہیگل بہت زور دیتا ہے وہ اُسے پیش کرتا ہوا کہتا ہے کہ مسیحی مذہب کی حقیقت فلسفہ کے وسیلے ہوگی نہ کہ تاریخ کے وسیلے سے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اس کی مفصل بحث کے لئے یہاں گنجائش نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ مفصل تذکرہ اس جگہ چھیڑا جائے۔ بالفعل اس سوال کے متعلق جس بات کی ہمیں ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اِس بات پر غور کریں کہ کیا مسیح کی حقیقت جو گذشتہ تاریخ سے علاقہ رکھتی ہے مانع ہے کہ عقل اور دل اور ضمیر کے لئے اُس میں مذہب کے بنیادی اصول دستیاب ہوں؟ آؤ ہم اس کی تحقیق کریں۔ مگر یہ لازمی امر ہے کہ ہم پہلے ہی سے کسی طرح کا فیصلہ نہ کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ اصل مقام کہاں ہے اور ہم دیکھینگے اور غور کرینگے کہ آیا ہم وہاں تک پہنچ سکتے ہیں یا نہیں۔ مسیحی مذہب کا اصل مقام مسیح ہے۔ اب ہم دیکھینگے کہ مسیح کی حقیقت کیا ہے؛

بعض لوگوں کے نزدیک یہ سوال کچھ وقعت ہی نہیں رکھتا کیونکہ فلسفیانہ رجحانوں اور مختلف فرقوں کے ہیلانوں کے ساتھ شیر و شکر کی طرح ملا ہوا ہے

پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ گلیلی پہاڑوں کے اوپر مباحثہ اور مناظرے کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں تو بھی کچھ مضائقہ نہیں۔ مشکلات ہمیں بیدل نہ کریں۔ آؤ ہم اُس بات سے مایوس نہ ہوں جو ہم اس عظیم حقیقت کے متعلق سادہ عقل اور صاف ارادے کے وسیلے دریافت کر سکتے ہیں۔ کم ازکم اس بات کے آزمانے کی کوشش ہم ضرور کریں۔ ایک شخص جو عالموں کے زمرہ میں شامل ہے کہتا ہے کہ کسی بات کا فیصلہ کہ آیا وہ جانی جاسکتی ہے یا نہیں بحث سے نہیں کرنا چاہئے بلکہ امتحان کے وسیلے کرنا چاہئے۔

دوسرا باب

مسیح کی حقیقت کیا ہے

یسوع مسیح لاریب ایسا آدمی ہے جو سب بنی آدم سے بزرگ ہے یاد رہے کہ آدمی کی بزرگی کا اندازہ دو باتوں سے کیا جاتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اُس کا اثر بنی نوع انسان پر کس درجہ تک پڑا۔ اور دوسری بات جس سے اُس کی عظمت کا تخمینہ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ اُس کی خصلت کیسی پاک اور عظیم تھی۔ جب ہم یسوع کو اِن کسوٹیوں پر کسکر آزماتے ہیں تو وہ بنی آدم کے درمیان سب سے افضل ثابت ہوتا ہے۔ وہ بنی آدم میں سب سے زیادہ اثر کرنے والا اور سب سے زیادہ پاک سیرت ہے ۔

جس بات پر ہم اِس وقت غور کر رہے ہیں وہ حقیقت المسیح ہے یعنی مذکورہ بالا باتوں میں سے ہم اس وقت دوسری پر لحاظ کر رہے ہیں یعنی اِس وقت جو بات زیر نظر ہے وہ بیشتر اس کی سیرت ہے نہ کہ وہ کام جو اُس نے کیا۔ اُس اثر کی نسبت جو اُس نے انسان کی زندگی اور تاریخ پر ڈالا ہے ہم اِس وقت فقط ایک نہایت پُر وزن جملہ کتاب موسومہ "مسٹر لیکی ہسٹری آف یوروپین مارلز" سے اقتباس کرینگے۔ مسٹر لیکی فرماتے ہیں کہ "یسوع کی مشغول زندگی کے تین چھوٹے چھوٹے سالوں نے بنی آدم کو از سرِ نو پیدا کرنے اور ملائم بنانے میں وہ کام کیا ہے جو فلاسفروں کی فلسفانہ تقریروں اور تجربوں سے اور معلمانِ علم الاخلاق کی تمام نصیحتوں سے نہ ہوا"۔ اگر یہ

بیان صحیح ہے تو اس آدمی کی تواریخی عظمت کو دیکھئے جسے ایک رومی مؤرخ نے ایک جملہ میں اور ایک یونانی ظریف شاعر نے ذرا سے تمسخر میں اڑا دیا۔ جس طرح وہ غیروں پر تاثیر پیدا کرنے میں لاثانی تھا۔ اسی طرح اخلاقی سیرت کے عالم میں ستارہ کی طرح چمکا اور ہر فرد بشر پر گوئے سبقت لیگیا اس کا مقابلہ کسی اور عارف یا بزرگ کے ساتھ کرنا اور یہ دکھانا کہ وہ اس سے اخلاقی سیرت میں بڑھ کر تھا بڑا آسان کام ہے۔ پر ایسا کرنا اس کی خصلت کی حقیقت کا صرف ایک شمہ ظاہر کرنا ہے۔ ہمیں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کی خصلت کی نسبت جو کامل سچائی پائی جاتی ہے۔ اس کا اظہار ایک وم کریں۔ اور وہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ہم یہ بتا دیں کہ ہم اس کی نسبت فقط اتنا ہی نہیں کہہ سکتے کہ اس میں اوروں کی نسبت گناہ کم اور نیکی زیادہ تھی۔ نہیں اس کی فضیلت ایسی اعلےٰ ہے کہ اس کے ساتھ کسی کا مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ لامحدود تھی۔ یسوع بیداغ آدمی تھا۔ وہی ایک ایسا آدمی تھا جو بیگناہ تھا۔

دعوئے نفی کو ثابت کرنا عموماً ایک مشکل کام ہوتا ہے اور جب اسے قطعی طور پر ثابت کرنا منظور ہو تو یہ کام اور بھی محال ہو جاتا ہے اور پھر جب کسی شخص کی نسبت پختہ طور پر یہ ثابت کرنا ہو کہ اس کی سیرت گناہ کے داغ سے مبرا ہے تو یہ کام ہزار درجہ محال ہو جاتا ہے لیکن یسوع مسیح کے متعلق اس امر میں ایسی مضبوط گواہی موجود ہے جیسی کہ کسی ثبوت طلب امر پر مل سکتی ہے۔ مثلاً اس بات کے گواہ اس کے دشمن ہیں۔ باوجود انکی نفرت اور کینہ ورچالاکی کے انہیں کبھی اس کے برخلاف کسی طرح کی اخلاقی بدچلنی کا الزام لگانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور ایسی ایسی باتیں

کہ "یہ آدمی گنہگاروں کو قبول کرتا اور اُنکے ساتھ کھاتا ہے" بے ضرر اور بے الزام صورت میں اُنکی زبان سے نکلیں۔ پھر اُس کے دوست بھی گواہ ہیں۔ اُنکے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گنہگاروں کے گناہ سے الگ تھا وہ تو پکے یہودی تھے۔ جنکے رگ وریشہ میں یہ تعلیم سرایت کرگئی تھی کہ ایک شخص بھی نیکوکار نہیں۔ ایک بھی نہیں"۔ لیکن مسیح کی نسبت وہ اِس تعلیم کے برعکس بولنے کے لئے مجبور ہوئے۔ ہاں انہیں اپنے نوشتوں کے برخلاف یہ کہنا پڑا کہ "ایک شخص ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا" اور پھر ہم بھی یسوع کی سیرت کی بیداغ کاملیت کے گواہ ہیں۔ کیونکہ اُس کے دوستوں نے ہمارے لئے اُس کی کاملیت کا بیان ایسی صفائی سے تحریر کیا ہے کہ اُس میں کسی طرح کا دھندلاپن نہیں پایا جاتا۔ اُنہوں نے اُس کی زندگی کے حالات گو مختصر طور پر تحریر کئے ہیں مگر وہ خاص خاص بیانات ہیں۔ وہ صرف اُسکی بیگناہی کا دعوے نہیں کرتے۔ کیونکہ ایسا کرنا مشکل نہ تھا وہ اُسکی بیگناہی کو اپنے بیان کی تصویر میں ظاہر کرتے ہیں اور یہ کام اُن سے کبھی نہ ہوسکتا اگر وہ باتیں جو وہ تحریر کرتے ہیں ایک حقیقی زندگی میں اُنکے سامنے پوری نہ ہوئی ہوتیں۔ ہم اُنکے بیان میں وہ باتیں جو مسیح نے ہر طرح کی حالتوں اور ہر طرح کے موقعوں پر کہیں یا کیں پاتے ہیں۔ ہاں وہ سب باتیں ہم کو وہاں ملتی ہیں جو اُس نے پبلک میں یا علیحدگی میں اپنی کامیابی کے عروج یا ناکامی کی تاریک حالت میں۔ اپنے دوستوں کے گھروں میں۔ یا اپنے دشمنوں کے سامنے۔ زندگی کے زمانہ یا اپنی موت کی آخری بڑی آزمائش کے وقت کہیں یا کیں۔ اُنکا بیان ایک مفصل تصویر ہے اور ایک ایسے آدمی کی تصویر ہے جس نے کبھی کسی موقعہ پر غلط قدم نہ اُٹھایا۔ اور نہ کبھی ایسا

لفظ اپنی زبان سے نکالا جو اُسے نکالنا نہ چاہیئے تھا۔ غرضیکہ وہ کبھی کمالیت کے درجے سے نہ گرا۔ پس یہ تصویر کسی صورت سے قیاسی نہیں ہو سکتی وہ چیز جو انسان کی نکتہ چینی سے بہت بلند ہے۔ وہ انسانی تصور اور قیاس سے بھی بہت بلند ہے۔ نکتہ سنج۔ جے۔ ایس۔ مِل۔ کہتا ہے "یہ دعوے کرنا کہ وہ مسیح جس کی تصویر انجیلوں میں کھینچی ہوئی ہے تواریخی مسیح نہ تھا بے فائدہ ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ جو باتیں قابلِ تعریف ہیں اُن میں سے کتنی اُس کے پیروؤں کی روائتوں سے ایزاد کیگئی ہیں" واقعی ایسا دعوے کرنا کچھ فائدہ نہیں رکھتا کیونکہ جیسا مِل آگے چلکر کہتا ہے کون اُس کے شاگردوں یا پیروؤں میں ایسا تھا اور مِل یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ کون شاعروں اور ڈراما نویسوں میں ایسا تھا۔ جو اُن اقوال کو جو مسیح سے منسوب کیئے گئے ہیں اپنے ذہن سے گھڑ سکتا یا وہ اُس تصویر کو جو مسیح کی زندگی اور سیرت کے متعلق صفحات اناجیل میں روشن ہے اپنے قیاس میں لاسکتا؟ الفاظ کے وسیلے تصویر کھینچنے کی لیاقت ایک اعلےٰ درجہ کا ہنر ہے۔ پھر یہ کہنا نادانی پر دلالت کرتا ہے یا بقولِ مِل "بے فائدہ ہے" کہ پہلی صدی کے چار یہودیوں میں یہ فن ایسے درجۂ کمال کو پہنچ گیا تھا کہ وہ سب کے سب عجیب یکتائی کے ساتھ خال و خط۔ رنگ ڈھنگ اور مختلف الوان کی شوخی اور کمی بیشی کا نقشہ اپنے ذہن سے تیار کرکے ایک کامل انسان کی تصویر پیش کر سکتے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے ایسا کیا۔ اور صرف ایک ہی قیاس ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کی قابلیّت اُن میں کس طرح آئی۔ اور وہ یہ ہے کہ اُنکے پاس اصل حقیقت موجود تھی اور اُن کے پاس ایک نمونہ موجود تھا اور اُنہوں نے اُس نمونہ کی نقل بڑی وفاداری سے اُتاری۔ اور چونکہ وہ

نمونہ بے نقص تھا اِس لئے فوٹو بھی بے نقص اُتری ۔

پس اِس بات کی تحقیق کے سلسلہ میں کہ یسُوع کیا تھا پہلا پُر زور اور حیرت افزا جواب جو ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ کیا نہ تھا یعنی وہ گنہگار نہ تھا۔ اور یہ بات فوراً ہمیں مسیح کی اُس پُر راز یکتائی تک پہنچاتی ہے اور اُسے حل بھی کردیتی ہے جس کے سبب سے وہ جو سب سے کمینوں اور حقیروں کا دوست اور بھائی تھا ایک معنی میں سب سے افضل اور بزرگ بھی تھا۔ جو جگہ یسوع بنی آدم کے درمیان رکھتا ہے اُسے پورے طور پر نہ سمجھنے کا سبب یہ ہے کہ لوگ اُس کا مقابلہ اور آدمیوں کے ساتھ کرنے لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ مقابلہ درست نہیں ہے کیونکہ اُس نے بنی آدم پر اپنا اثر نہ صرف بہت بڑے درجہ تک ڈالا ہے بلکہ ایسی صورت میں بھی ڈالا ہے کہ کسی اور شخص نے ایسا نہیں ڈالا ہے۔ پس دل نہیں چاہتا کہ وہ اوروں کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ جب کوئی شخص جو اُسکی زندگی سے واقف ہوتا ہے اُس کا نام ایسی فہرست میں دیکھ لیتا ہے جسکے شروع میں کنفیوشس اور آخر میں گرتے کا نام آتا تو وہ اُسے ایک قسم کی گستاخی سمجھتا ہے۔ ایسی گستاخی جو مذہب کے اس قدر برخلاف نہیں ہے جس قدر کہ عام تہذیب کے خلاف ہے۔ یسوع مسیح دنیا کے بڑے بڑے بزرگوں کے زمرے میں شامل نہیں ہے۔ اگر تم چاہو تو سکندر اعظم۔ چارلس اعظم اور نپولین اعظم کہو۔ اگرچہ یسُوع جیسا کہ ہم نے دیکھا دنیوی صورت میں بھی ان میں سے ہر ایک سے ایسا بڑا تھا کہ اُنکے ساتھ اُسکا مقابلہ کرنا فضول ہے تو بھی کون اس کو یسُوع اعظم کہیگا؟ یسُوع ان سب سے جدا ہے وہ اس سے اور اُس سے فقط بڑا ہی نہیں ہے۔ وہ نرالا اور یکتا ہے۔ وہ فقط

یسوع ہے اور اُس میں اور کوئی چیز ایزاد نہیں کیجا سکتی ۔

یسوع کی یہ یکتائی دو صورتوں میں ۔ یوں کہیں کہ دو درجوں میں نظر آتی ہے اوّل ۔ اُس کے سارے طریق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی اخلاقی خوبی میں اور دیگر اشخاص کی اخلاقی خوبیوں میں کوئی نسبت ہی نہیں پائی جاتی ۔ وہ جو کہ اور لوگوں کو اُس بدی کی نسبت جو اُنکے دلوں میں پائی جاتی تھی بڑی رقت سے خبر دیا کرتا تھا ۔ کبھی اپنی بدی یا گناہ کا اقرار نہیں کرتا ۔ وہ جو کہ ہر ایک نا امید گنہگار پر ہر طرح یہ ظاہر کیا کرتا تھا کہ میں ہر طرح تیرا بھائی ہوں کبھی یہ نہیں کہتا تھا کہ گناہ میں بھی میری حالت تیرے جیسی ہے ۔ وہ جو کہ اخلاقی معاملات میں ایسا نازک احساس تھا کہ اپنی اسی خوبی کے سبب سے تمام بنی آدم کی گو یا ضمیر بنگیا ہے لوگوں کو علانیہ کہا کرتا تھا کون تم میں سے مجھپر گناہ کا الزام لگا سکتا ہے؟ اِن ساری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عدیم المثل تھا ۔ ہاں وہ نہ صرف گنہگاروں سے الگ تھا بلکہ مقدسوں سے بھی نرالا تھا ۔ بنی آدم کے درمیان جو مقدس گذرے ہیں وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح معرفت کے اعلےٰ زینہ تک پہنچے ۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح نچلے زینہ سے شروع کرکے آنسوؤں اور دعاؤں سے محنت کرتے ہوئے اور توبہ کے کٹھن راستہ سے گذر کر وہ نئی زندگی کی راہ تک پہنچے ۔ زبور نویس ہمکو یہی بتاتے ہیں ۔ اور یہی صدا مقدسوں کے اقراروں سے آتی ہے اور یہی خبر وہ تمام جماعت دیتی ہے جس کے شرکا کے دل پاکیزگی اور حلم سے پُر تھے ۔ لیکن یسوع کبھی ایسی خبر نہیں دیتا ۔

واضح ہو کہ یہی ایک بات اِس صداقت کا کامل اظہار نہیں ہے ۔ کیونکہ یسوع کی اِس اخلاقی بے نظیری کے متعلق ایک اور بات بھی غور طلب ہے

اور وہ نفی کی صورت نہیں رکھتی بلکہ اثبات کی صورت رکھتی ہے۔ یسوع کے متعلق صرف یہی بات دیکھنے میں نہیں آتی کہ اُس نے کبھی کسی اخلاقی نقص یا اخلاقی ضرورت کا اقرار نہیں کیا بلکہ یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ اُس نے ہمیشہ اپنے تئیں ایسا ظاہر کیا کہ گویا وہ اوروں کی ضرورتوں کا پورا کرنے والا ہے۔ ہمنے پچھلے لیکچر میں اس کی طرف کچھ اشارہ کیا تھا اور ہم یہاں اس کی مزید توضیح اور تشریح کی ضرورت نہیں دیکھتے کیونکہ اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جس طرح اس کی توضیح مشرح بیان سے ہوتی ہے اسی طرح ایک سادہ اور مختصر سے بیان سے ہوتی ہے۔ آپ اس آواز کو سُنیں۔ اگر کوئی پیاسا ہو تو میرے پاس آئے اور پیئے۔" اے تم جو تھکے اور بڑے بوجھ سے دبے ہو میرے پاس آؤ۔ میں تم کو آرام دونگا" یہ دو مقام کافی ہیں۔ اِن میں ایک ایسے شخص کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے جو نہ صرف خود ہر طرح کی اخلاقی تکلیف سے بری ہے بلکہ اوروں کو بھی ہر قسم کی تکلیف سے رہائی دے سکتا ہے۔ اور لوگ شل کھوئی ہوئی بھیڑوں کے ہیں۔ پر وہ نہ صرف خود گم گشتگی سے آزاد ہے بلکہ بھیڑوں کا گڈریا بھی ہے اور لوگ بیمار ہیں۔ مگر وہ نہ صرف تندرست ہی ہے بلکہ حکیم بھی ہے۔ اوروں کی زندگیاں ضبط ہو چکی ہیں۔ مگر اُس کی زندگی نہ صرف اُسی کی ہے بلکہ اوروں کے لئے فدیہ میں بھی دیجاتی ہے۔ اور لوگ۔ ہاں اور سب لوگ گنہگار ہیں۔ مگر وہ نہ صرف گناہ سے مبرا ہے بلکہ گنہگاروں کا نجات دہندہ بھی ہے۔

یہ باتیں ضرور ہر ایک صاف دل اور سرگرم آدمی پر اپنا اثر ڈالینگی۔ انسانی فطرت کے سارے سلسلے میں کوئی بات بھی انکی مانند نہیں ہے۔

اُنہیں معتقدانِ دینِ عیسوی کی مبالغہ آمیز تعلیمات نہیں سمجھنا چاہئے - وہ زمانہ جدید کی نکتہ چینی کے نتائج ہیں۔ زمانہ حال کے ذہنی علم کا یہ ایک عجیب خاصہ ہے کہ لوگ اُس مسیح کا جسے زمین پر سے گذرے اُنیس سو برس سے زیادہ ہو گئے ہیں پھر مطالعہ کر رہے ہیں۔گذشتہ صدیوں میں اُسکا شخصی نقشہ اکثر نظر انداز کیا گیا۔ اور اُس کا انسانی چہرہ پُرراز عبادت کے پردہ تلے چھپایا گیا۔ یا تعلیمات اور مسائل کے برقعہ نے اُسے ڈھانپ رکھا - مثلاً رومی کلیسا کے اندر یسُوع ایک ایسے چہرے کا عکس بنا رہا جو دور سے دکھائی دیتا ہے ۔جس کی درد انگیز خوبصورتی کے سامنے فقط اسرار پسند اشخاص نے سجدہ کیا لیکن اس کی زندہ صورت جیسی کہ وہ جلیل میں نظر آئی کبھی خیال اور عمل کی دنیا میں نظر نہیں آتی تھی - اور پراٹسٹنٹ مسیحیوں کے لئے وہ ایک عہدہ دار آدمی کی طرح تھا جسکا کام یہ تھا کہ بعض باتوں کو انجام دے - وہ اُن کے لئے ابنِ آدم نہ رہا۔ اِن دونوں باتوں سے ہمارے زمانہ کے لوگ اپنا مُنہ پھیر کر یہ پوچھ رہے ہیں - اور ایک نئی سرگرمی کے ساتھ پوچھ رہے ہیں - اور پھر مذہب کے نام سے نہیں اور نہ اُسکی خاطر۔ بلکہ تاریخ کی صداقت کو دریافت کرنے کے لئے پوچھ رہے ہیں۔ (اور یہ وہی پُرانی خواہش دیدار ہے جو پکھوا رہی ہے) کہ یسُوع کہاں ہے؟ "ہم یسُوع کو دیکھنا چاہتے ہیں"۔ اِس سوال کا بڑا عجیب جواب مِلا ہے - تواریخی معاملات کو دریافت کرنے والی روح نے جس نے کہ گذشتہ پچاس سال کے عرصہ میں علم کی ہر شاخ پر گہرا اثر ڈالا ہے مسیحیت کے مطالعہ اور خصوصاً یسُوع کی زندگی اور سیرت اور شخصیت کے مطالعہ کو بھی عجیب طور پر موثر کیا ہے مثلاً اُس کی بے شمار سوانحعمریاں جو اُسکی زندگی کے ہر پہلو کو

خاص طور پر ظاہر کرتی ہیں لکھی گئی ہیں - اہل تنقید نے اِس سوال کے ہر تواریخی پہلو پر نکتہ چینی سے تحقیق اور تنقید کو روا رکھا ہے - چنانچہ اُسکی زندگی اور کام اور سرگذشت اور شخصیت پر خوب غور کیا گیا ہے - اور اُس کی خوبی کو ایسا محسوس کیا ہے کہ آگے کبھی ویسا محسوس نہیں کیا تھا - یہ کہنا حقیقت سے تجاوز کرنا نہیں ہے کہ اِس تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ یسوع جو ملک فلسطین میں رہا کرتا تھا - وہ ہمارے زمانہ کے لوگوں کو ایسی صفائی سے نظر آیا ہے کہ ویسی صفائی سے بجز اپنے زمانہ کے لوگوں کے اور کسی زمانہ کے لوگوں کو نظر نہیں آیا تھا اور اِن باتوں کا کیا اثر ہوا؟ یہ کہ یسوع کی عجیب اور انوکھی اور پر راز یکتائی اور بے نظری آگے کبھی ایسی مانی نہیں گئی جیسی اب مانی جاتی ہے - ہاں اس زمانہ کے اہل تنقید کی نظر میں یسوع مسیح لاریب ایک نظارۂ بے مثل ہے - اِس بات کی نظیر کے لیئے ہم کیم صاحب کی کتاب پیش کرسکتے ہیں اس میں کیم مسیح کی بے نظیری کو ایسے طور پر محسوس کرتا ہے کہ اپنے احساس کو قابو میں نہیں رکھ سکتا حالانکہ اُس کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس امر پر کچھ نہ کہے تو بھی وہ اِس خواہش کی حد سے گذر کر اسکی عدیم المثلی پر بہت کچھ تحریر کرتا ہے چنانچہ وہ کچھ کچھ اس طرح لکھتا ہے - یسوع میں وہ بات پائی جاتی ہے جو اوروں میں نہیں پائی جاتی - اور جس قدر ہم زیادہ درستی اور تحقیق سے اُس کا علم حاصل کرتے ہیں اُسی قدر زیادہ ہم اس بات کو محسوس کرتے جاتے ہیں وہ ہماری تشریح سے کہیں بالا اور بلند ہے - وہ اُن قوانین کو جو ہم انسانی فطرت کی نسبت تسلیم کئے بیٹھے ہیں تہ و بالا کر دیتا ہے - وہ ہماری نکتہ چینی کو مجبور کرتا ہے کہ اپنی حدود سے تجاوز کر جائے - وہ ہمارے روحوں کو دہشت سے بھر دیتا ہے - چارلس لمب کا مشہور قول ہر شخص کے دل میں

جو یسُوع کی شخصیت کا سنجیدہ محقق ہے گونج اُٹھتا ہے ۔ وہ قول یہ ہے ۔ "اگر شکسپیر اِس کمرے میں آئے تو ہم سب اُس کے استقبال کے لئے کھڑے ہو جائینگے ۔ پر اگر وہ (مسیح) یہاں آجائے تو ہم سب سجدے میں گر جائیں اور اِس بات کی کوشش کرینگے کہ اُس کے کپڑے کا دامن پکڑ لیں" ؟ ؛

اب جو کچھ کہا گیا وہ سب ہمنے سُن لیا ۔ اور بھی بہت کچھ بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے ۔ مگر ضرورت نہیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اِن باتوں میں ہم نے اُس سوال کا جواب پایا جس کا جواب دینا ہم چاہتے تھے ! ممکن ہے کہ یسُوع کی سیرت بے داغ ہو اور اُس کی شخصیت انسانی فطرت کے دائرہ میں پُر راز اور بے نظیر ہو ۔ ممکن ہے کہ وہ بنی آدم کی عام اخلاقی ضرورتوں کی قید سے آزاد تھا بلکہ اوروں کی ضرورتوں کو بھی جو اُس کے اردگرد رہتے تھے رفع کر سکتا تھا ۔ مگر با ایں ہمہ پُرانا اعتراض قائم ہے کہ یہ سب باتیں مدت ہوئی گذر گئیں ہمیں اُنسے کیا واسطہ ؟ یہ باتیں خواہ کیسی ہی عجیب کیوں نہ ہوئی ہوں ۔ ہمارے لئے آج اُن میں کونسے مذہبی اُصُول مندرج ہیں ؟ مذہب کے اُصول تو رُوح کے اندر اب موجود اور زندہ ہونے چاہئیں ۔ جو کچھ یسُوع کی نسبت کہا گیا وہ محض تواریخی بیان ہے اور تواریخی بیان اِس تذکرے کو دینی معاملہ نہیں بناتا ۔ یاد رہے کہ مسیح کی حقیقت جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں تاریخ کا ایک واقعہ ہے ۔ گو یہ دکھانا ابھی باقی ہے ۔ جیسا کہ گذشتہ لکچر میں بتاکید کہا گیا ۔ کہ اِسی تاریخی حقیقت میں شخصی اور روحانی مذہب کے اُصول موجود ہیں ؛

اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم یسُوع کی نسبت اور بھی سوچیں اور اِن تواریخی اثروں کو اُنکے انجاموں تک پہنچائیں ۔ اور ہم دیکھینگے کہ

یسُوع کی حقیقت پر غور کرتے ہوئے کئی نتائج ایسے ملینگے جو مذہبی نتائج کہلا سکتے ہیں - مثلاً ہم صفحۂ تاریخ پر اس بیداغ آدمی کی صورت کو معائنہ کرتے ہیں - اور ہماری ضمیریں فی الفور ایک عجیب صورت میں اِس بات کو معلوم کرلیتی ہیں کہ ہم خود اخلاقی طور پر کیسے آدمی ہیں - اور ہم ایسے طور پر اِس بات کو معلوم کرتے ہیں کہ آگے کبھی ایسے طور پر معلوم نہیں کیا تھا ہم اثنائے تحقیق میں ایک تواریخی بشارت کی خبر سُنتے ہیں بشارت کی دعوت کی خبر پاتے ہیں جو مدت ہوئی یسُوع نے اُن سب لوگوں کو دی جو اخلاقی ضرورت میں مبتلا تھے اور یہ کہکر دی کہ تم میری بات کو سنو اور میرے پاس آؤ - جب ہم اِس بات کو پڑھتے ہیں تو ہم زیادہ زیادہ اِس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ اِس کا یہ مطلب ہے کہ ہم بھی اِس امر کا اپنی نسبت فیصلہ کریں - اب یہ سب باتیں کیا ہیں؟ کیا یہ مذہب نہیں؟ مگر یہ سب خیالات مسیح کی حقیقت سے پیدا ہوئے ہیں - آؤ ہم اس بات کے سمجھنے کی کوشش کریں کہ کس طرح ہمارے وہ خیالات جو مسیح سے نسبت رکھتے ہیں اخلاقی اور مذہبی نالیوں میں بہنے لگ جاتے ہیں *

جو بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے - کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہم حقیقت المسیح پر اپنی ضمیر اور مرضی کے ساتھ صدق دِلی سے غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت بڑے بڑے اخلاقی سوالات کو ہمارے اندر پیدا کرتی ہے - یاد رہے کہ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط یسُوع کے نمونہ یا تعلیم ہی میں کوئی ایسی بات تھی جس نے ہمیں ہمارا کوئی فرض یا ہمارا کوئی نقص ظاہر کیا نہیں اِس سے کہیں زیادہ تجربہ سے گذرتا ہے - یعنی یہ کہ ہماری اخلاقی زندگی کا کل سوال برپا ہو جاتا ہے - اور مسیح کی حقیقت فقط ایک تاریخی حقیقت

ہی نہیں رہتی بلکہ ضمیر کی حقیقت بن جاتی ہے۔ وہ حقیقت ہماری اخلاقی
ہستی کو پکڑ لیتی ہے اور اُس سے باز پرس کرتی ہے۔ وہ اُس سے سوال
کرتی۔ وہ یہ دعوےٰ کرتی ہے کہ میں بطور منصف تمہاری زندگی کے تمام خیالات
اور جذبات اور ارادات پر غور کرنے کا اختیار رکھتی ہوں۔ اور وہ اپنا یہ دعوےٰ
ایک ناگزیر طور پر اور ایک عجیب اختیار کے ساتھ قایم کرتی ہے پس جسقدر
ہم زیادہ زیادہ اپنی عقلوں اور دلوں کے دروازے کھول دیتے ہیں
تاکہ مسیح کی حقیقت کی خوبی کا تواریخی احساس ہمارے اوپر اپنا اثر پیدا
کرے اُسی قدر زیادہ زیادہ وہ اثر اخلاقی انجاموں کی صورت اختیار کرتا
جاتا ہے۔ ہمنے عقلی طور پر اُس کا امتحان شروع کیا تھا مگر اب ہم کیا دیکھتے
ہیں؟ یہ کہ وہ روحانی طور پر ہمارا امتحان کر رہا ہے۔ اور یوں وہ کام جو
ہم کرنے لگے تھے وہ کرنے لگ گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو تاریخی
اور عقلی سوالات ہمنے یسوع کی بابت پوچھنے شروع کئے تھے وہ بند ہوگئے
بلکہ یہ کہ جو اخلاقی سوالات اُن میں سے ہماری نسبت پیدا ہوئے وہ
ہمارے ساتھ بڑا سنجیدہ اور پُر زور اور ذاتی علاقہ رکھتے ہیں۔ ہزارہا
آدمیوں کی جو انجیلوں کو پڑھتے ہیں یہی شہادت ہے۔ یہ ایک عجیب بات
ہے۔ جب ہم ارسطو کی کتابوں کو پڑھتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم
عقلی طور پر ترقی کر رہے ہیں۔ لیکن جب ہم یسوع پر غور کرنے لگتے ہیں
تو ہماری روحانی حالت میں گہرے طور پر خلل پیدا ہو جاتا ہے پس یہ
سوال کہ تم مسیح کی نسبت کیا کہتے ہو؟ جو شروع میں محض تواریخی صورت رکھتا
تھا اور کسی طرح کا اخلاقی مقصد نہیں رکھتا تھا رفتہ رفتہ ایک نہایت
عملی اور شخصی صورت اختیار کرکے اِس سوال میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ میں

یسوع کے ساتھ کیا کروں ؟ اور یہ سوال ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اسکا جواب دیں ؛

اِس کا یہ مطلب ہے ۔ کہ ہم ایک تاریخی شخص کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں جو ہم کسی تواریخی شخص کے ساتھ نہیں کرتے ۔ یعنی ہم مجبور کیئے جاتے ہیں کہ اِس یسوع کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ایک باطنی اخلاقی رشتہ اپنے دِل اور مرضی کے اندر قائم کریں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہم عملاً اپنے آپ کو ایسا کرتے پاتے ہیں اور ہم اِس بات سے کسی طرح پہلوتہی نہیں کرسکتے ۔ آدمی اگر چاہے تو یسوع پر عقلی طرفداری کے بغیر غور کرسکتا ہے ۔ مگر وہ اخلاقی میلان کے بغیر ایسا نہیں کرسکتا ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ یہ چاہے کہ میں اُسپر غور کروں اور میری اخلاقی زندگی پر اُس کا کچھ اثر نہ ہو تو یہ ناممکن ہے ۔ اگر یسوع کے اقوال اور اُس کی سیرت اور شخصیت ایسے خیالوں کو جیسے کہ اوپر تحریر ہوئے پیدا کرتی ہے تو ہم یہ سمجھکر کہ گویا وہ ہمارے دل میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ اُنہیں چھوڑ سکتے ہیں ۔ کیونکہ اِس قسم کے سوالات جب ایک مرتبہ پیدا ہو جاتے ہیں تو ضرور اپنا جواب طلب کرتے ہیں اور اُنکو نظرانداز کرنا بھی اُنکا ایسا ہی ایک حقیقی جواب ہے جیسا کوئی اور جواب ہو سکتا ہے پس جیسا ہم عرض کرچکے ہیں ہمیں کوئی نہ کوئی رشتہ اِس حقیقت مسیح کے ساتھ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے خواہ ہم اُس روشنی اور اختیار کو جو یسوع کے نام سے مربوط ہیں دل سے قبول کریں اور بڑھنے دیں اور اُن کی متابعت کریں یا نہیں ۔ رد کرکے اُنکا اِنکار کریں ۔ اِن دونوں باتوں میں سے ایک کو ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ ہم اِس بات کو اپنے سے پوشیدہ رکھنے کی

خواہ کتنی ہی کوشش کریں تو بھی ہم ضرور محسوس کرینگے کہ ہم اس سوال کا جواب اِن دونوں صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت میں دے رہے ہیں اور وہ جواب جو ہم اِس سوال کو دیتے ہیں ہماری اخلاقی حالت اور اخلاق آئندہ کے لئے ایک سنجیدہ مطلب رکھتا ہے واقعی یہی وہ موقعہ ہے جبکہ یہ بات کہ ہم نیکی اور بدی کی ابدی لڑائی میں کس جانب کو انتخاب کرتے ہیں صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔آہ۔یہی وہ جنگ ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔یہ وہ جنگ ہے جس میں ایسی فوجیں جو اپنے فن میں ماہر نہیں ہوتیں اور محض شور مچاتی ہیں۔ نہیں آتی ہیں۔یہی وہ جنگ ہے جس میں ایک عظیم لڑائی حقیقی اور شخصی طور پر کیجاتی ہے اور جس میں یہ لازم ہوتا ہے کہ ہم اپنا جھنڈا کھڑا کریں۔یہی وہ نتیجہ ہے جو اُس ربط سے جو ہم مسیح سے رکھتے ہیں پیدا ہوتا ہے۔ہم اپنے کام کو بڑے خاموش مطالعہ سے شروع کرتے ہیں۔مگر تھوڑی دیر بعد ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اخلاقی فیصلہ کے اُس میدان میں اُتریں جہاں کئی لوگ اپنے اندر ایسی طاقتیں محسوس کرتے ہیں جو بغیر سخت لڑائی کے اپنے آپ کو یسُوع کے حوالہ نہیں کرتی ہیں۔ہم یسُوع کی تحقیقات سے اِس سوال کو شروع کرتے ہیں مگر تھوڑی دیر کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ یہ سوال خود ہماری طرف راجع ہو جاتا ہے اور اِس کا جواب اُس رُخ پر منحصر ہوتا ہے جو ہم مسیح کی طرف اختیار کرتے ہیں۔بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہی پہلو اِس سوال کا جواب ہوتا ہے شاید کسی کو یہ بات مبہم سی معلوم ہوتی ہو۔اور وہ پوچھے کہ اِس رُخ سے کیا مراد ہے؟ اس سے یہ مراد ہے کہ یہ ایک ایسی عملی بات

ہے جس سے بڑھکر اور کوئی عملی بات دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ اگر
ہم مذہبی استعمال کی مروجہ اصطلاحات کو چھوڑ دیں (یہ سمجھکر نہیں کہ وہ
غلط ہیں بلکہ یہ سمجھکر کہ باسانی عادم حقیقت کی ممد ہوجاتی ہیں) اور
زندگی کی بعض واضح حقیقتوں پہ غور کریں تو مطلب ظاہر ہو جائیگا بلکہ
اِس قدر ظاہر ہو جائیگا کہ ہم بعض اوقات اُس کی اتنی وضاحت کی
پرواہ بھی نہیں کرینگے۔ زندگی کی دو جدا جدا راہیں ہوتی ہیں جو خیال
اور فعل میں نظر آتی ہیں اُن میں سے ایک تو مسیح کے نور اور اثر کی ضرورت کیطرف لیجاتی
ہے اور دوسری اُلٹے راستے پر لیجاتی ہے۔ یہ راہیں چھپی ہوئی نہیں ہوتی
ہیں بلکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کب وفاداری کے ساتھ یسوع کی طرف جارہے
ہیں اور کب اُسے نظرانداز کر رہے ہیں۔ پس ہر ایک آدمی کی زندگی میں چھوٹی
اور بڑی سب طرح کی باتوں کے متعلق یہ راہیں پیش آتی ہیں۔ اور ہر ایک
سنجیدگی طلب اخلاقی انتخاب کے وقت یہ راہیں ہم کو جُدا جُدا نظر آنے لگجاتی
ہیں۔ اگر کوئی شخص جو یہ دیکھ رہا ہے کہ مسیح کی حقیقت مجھ میں ضمیر کی حقیقت بنتی
جاتی ہے جس کے ساتھ بڑے بڑے اخلاقی انجام وابستہ ہیں اگر کوئی ایسا شخص
چاہے تو قصدًا اُسے روک سکتا ہے کہ وہ آگے اُس راہ میں اُس کی رہنمائی
نہ کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس سے اس
بات کا تعلق ہو تو وہ اُس راہ کو اختیار کرے جو اُسے اُس جگہ نہیں لیجاتی
جہاں یسوع کی آواز بخوبی سُنائی دیتی اور جہاں اُس کے اثر کا اختیار زیادہ اپنا
سکہ جماتا ہے۔ ایسی حالت میں تعجب نہیں کہ اُس کے لئے مسیحیت کی
اصل حقیقت فقط تاریخ کا ایک عام سا واقعہ بنجائے۔ اور وہ اُس میں
مذہب کے لئے کوئی اصول نہ پائے۔ لیکن آدمی دوسری راہ بھی اختیار

کرسکتا ہے کیونکہ یسوع کی باتوں میں بہت کچھ پایا جاتا ہے جو اُسے اِس راہ کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور نیز اُس کے دل میں بہت کچھ موجود ہے۔ جو اُسے اِس راستے پر چلنے کی نصیحت کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بڑی جانفشانی اور سادگی سے اِس راستہ پر چلنے کو تیار ہو۔ اور اگر وہ ایسا کرے۔ ہاں اگر وہ صدق دِلی سے ایسا کرے اور اپنے دِل میں بُری باتوں کو چپٹے رہنے کا کوئی خیال بھی نہ رکھے تو اُس کے لئے حقیقت مسیح فی الواقع مذہب کی ایک حقیقت بن جائیگی۔ مسیح کا مذہب اِس بات سے ایک خاص قسم کے معنے اور ایک خاص قسم کی صورت اخذ کرتا ہے یعنی وہی یسوع جو پہلے تاریخ اور نکتہ چینی کا یسوع تھا۔ اور جو پھر ضمیر اور اخلاقی نور اور فیصلہ کا یسوع بنا تھا اب روحانی وعدے اور بہبودی اور نیکی کے اندرونی تجربہ کا یسوع بنجاتا ہے۔ ہاں یسوع کا نام ایک عجیب طور پر انسان کی اعلےٰ ہستی اور سچی زندگی کا دوسرا نام بنجاتا ہے۔ واقعی یسوع اُس آدمی کی زندگی ہے جو ہچکچاتی ہوئی حیرانی کے ساتھ اپنے آپ کو اُن لفظوں پر جو اُس نے بارہا سنے تھے اور جنہیں وہ مبالغہ سمجھا کرتا تھا ایک حقیقی چسپاں کرتے پاتا ہے خواہ وہ معنے خفیف اور تبدل پذیر ہی کیوں نہ ہوں۔ اور وہ لفظ یہ ہیں "میں زندہ ہوں تو بھی میں نہیں بلکہ مسیح جو مجھ میں زندہ ہے"۔

اب یہی بات جسے ہم نے یہاں ظاہر کیا اور جسکی پیروی زیادہ خبرداری سے آگے چلکر کرینگے مذہب ہے۔ یہی وہ زندہ روحانی صداقتیں ہیں۔ جنہیں مذہب طلب کرتا ہے۔ یہ مردہ تاریخ نہیں ہیں۔ تو بھی تاریخ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور اُنکا منبع قیاسی تصورات اور اصولوں میں نہیں ہے

بلکہ اُسی حقیقی تواریخی اظہار میں پایا جاتا ہے۔ پس اُس پر غور کرنے سے نہ صرف ہم کو تواریخی قیاسات معلوم ہوئے بلکہ ایمان کی بنیاد بھی مِل گئی۔ یہی حقیقت جو تاریخی عالم میں شروع ہو کر ضمیر پر چھا جاتی ہے اور پھر روحانی تجربہ میں انجام پاتی ہے دراصل وہ حقیقت ہے جس پر مذہب کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ اور جس کے وسیلے سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ مسیحی مذہب کی پُرانی بنیاد آج بھی مذہب کی عمارت کیلئے کام آسکتی ہے:

پس یہی وہ حقیقت مسیح ہے جو تاریخ اور ضمیر اور روحانی تجربہ کی بھی حقیقت ہے۔ اب جس وقت ہم مسیح کی حقیقت کو بیان کرنے لگیں گے اُس وقت اِس بات کی ضرورت ہو گی کہ ہم اُسے کامل صورت میں پیش کریں۔ ہم کامل طور پر نہیں بتاتے کہ یسوع کیا ہے۔ جب ہم صرف اتنا بتاتے ہیں کہ انیس سو سال کا عرصہ گذرا اُس نے ملک فلسطین میں یہ کہا اور یہ کیا اور اِس طرح اوقات بسر کی۔ کیونکہ وہ صرف ایک پُرانی تواریخی حقیقت ہی نہ تھا بلکہ اس سے کہیں بڑھکر تھا۔ وہ ہمارے موجودہ اور شخصی تجربہ کی بھی ایک دائمی زندہ حقیقت ہے۔ واقعی آپ حقیقت مسیح کا حق پورے طور پر ادا نہیں کرتے جب تک کہ آپ اُسپر اس طرح غور نہیں کرتے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ یعنی اُسے پہلے ایک تواریخی اظہار۔ اور پھر ایک ایسا اظہار نہیں سمجھتے جو کہ عجیب طور پر اپنے آپ کو ضمیر کے لئے ایک حقیقت بنا دیتا ہے یعنی اگر آپ اُسے باطنی منصف اور دعوت اور وعدہ اور تازگی نہیں جانتے تو آپنے اُسپر بخوبی غور نہیں کیا۔ ہاں جب تک آپ ان دونوں عنصروں کو قبول نہ کریں آپ اُسے جیسا کہ وہ درحقیقت ہے ظاہر نہیں کرتے۔ اِن دونوں باتوں میں سے کوئی بھی بغیر دوسری کے مکمل نہیں ہے۔ زمانہ حال کا ایک

عالم کہتا ہے۔ کہ جب ہم صرف رُوحانی یا صرف تاریخی مسیح پر غور کرتے ہیں یعنی ایک پہلو پر غور کرتے اور دوسرے پہلو کو چھوڑ جاتے ہیں۔ تو ہمارے غور و فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ایک بگڑی ہوئی تصویر دستیاب ہوتی ہے"۔

پس اگر ہم اپنے مذہب کی بنیاد حقیقت المسیح پر قائم کرنا چاہیں تو لازم ہے کہ ہم خبردار رہیں کہ اُسے بگڑی ہوئی تصویر پر قائم نہ کریں۔ یعنی اُس حقیقت کے محض یکطرفہ اظہار پر اپنے مذہب کی بنیاد نہ ڈالیں۔ یہ حقیقت ایسی حقیقت ہے جو دو پہلو رکھتی ہے پس مسیحی مذہب اُس مسیح پر قائم ہے جو کہ جس طرح تاریخ کی ایک حقیقت ہے اُسی طرح تجربہ کی بھی حقیقت ہے۔ اور ہمیں ان دونوں پہلوؤں کو زیر نظر رکھنا چاہیئے۔ اگر ہم اپنے آپ کو صرف تاریخ کے مسیح پر محدود کر رکھیں اور اس طرح کہ گویا ہم ایک مُردہ اُستاد اور اُس کی تعلیم پر غور کر رہے ہیں۔ یا اگر ہم برعکس اس کے صرف تجربہ کے مسیح پر غور کریں اور اس بات پر لحاظ نہ کریں کہ وہ تواریخی صورت میں کیا تھا تو یقیناً ہم ایک مضبوط اور وسیع بنیاد پر عمارت اُٹھانے میں کامیاب نہ ہونگے۔ مسیحی مذہب کی بنیاد مسیح ہے۔ پر یاد رہے کہ دو مسیح نہیں ہیں کہ ہم اُن میں سے ایک پر اپنی بنیاد قائم کریں۔ مسیح ایک ہی ہے۔ مگر وہی ایک مسیح خارجی تاریخ میں بھی اور باطنی تجربہ میں بھی پایا جاتا ہے پس ہمارا مسیحی مذہب مسیح کی کامل حقیقت پر مبنی ہو۔ پروفیسر ڈینی صاحب فرماتے ہیں کہ "مسیحی مذہب اس بات پر منحصر نہیں کہ مسیح کیا تھا بلکہ اس بات پر مبنی ہے کہ وہ کیا ہے" دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ یہ مذہب اُس مسیح پر مبنی ہے جو جس طرح تاریخ کی حقیقت ہے اُسی طرح تجربہ کی بھی حقیقت ہے ؂

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تحقیقات کا دائرہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ہمنے شروع میں دیکھا (گو مختصر طور پر دیکھا کیونکہ بات کو طول نہیں دیا گیا کیونکہ یہ ایک ایسی بات ہے جو بار بار ثابت کیگئی ہے) کہ قدیم مسیحی مذہب علم الہٰی کے اصولوں یا اخلاقی تصورات پر قائم نہ تھا بلکہ یسوع مسیح کی شخصیت کی حقیقت پر مبنی تھا۔ اور پھر جب ہم آگے بڑھے اور ہم نے یہ دریافت کیا کہ کیا ہمارا مسیحی مذہب بھی اُسی بنا پر قائم ہو سکتا ہے یا نہیں تو ہم نے دیکھا کہ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ حقیقت گو ایک ایسی تواریخی حقیقت ہے کہ اُسے گذرے اُنیس سو برس ہو گئے۔ تو بھی یہ حقیقت ایک ایسی حقیقت ہے جو ضمیر اور اخلاقی زندگی اور تجربہ کی ایک حقیقت بنکر اب بھی ہمارے کام آتی ہے اور ہمارے لئے ایک موجودہ زندہ صداقت کا چشمہ یعنی مذہب کا چشمہ بن سکتی ہے۔ پس اس تحقیق کے وسیلے ہمنے نہ صرف مذہبی عمارت کی جگہ ہی پائی بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا کہ ہم اسپر اپنے مذہب کی عمارت قائم بھی کر سکتے ہیں اور اب ہم اس عمارت پر غور کرینگے یعنی اب ہم اس بات کے دیکھنے اور ترتیب دینے اور ظاہر کرنے کی طرف متوجہ ہونگے کہ مذہب کیلئے اس حقیقت میں کیا کچھ پایا جاتا ہے یا یوں کہیں کہ ہم یہ دریافت کرینگے کہ حقیقت المسیح کا مطلب یا فائدہ کیا ہے؟

لیکن اس تحقیق کو شروع کرنے سے پیشتر ایک بات کو ہمیں خوب سمجھ لینا چاہئے کیونکہ ہماری ساری تحقیق کی کامیابی اُسی کے قبول کرنے پر منحصر ہے۔

ہم اس بات پر زور دیتے آئے ہیں کہ ہمیں کامل حقیقت المسیح کو بیان اور امتحان کرنا چاہئے اور کہ کامل حقیقت صرف ظاہری تاریخی واقعہ پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اُس میں اندرونی تجربہ بھی شامل ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اگر ہم اس حقیقت کا مطلب دریافت کرنے لگیں تو ہمیں عقلی روشنی کے علاوہ ایک اور بات کی بھی

ضرورت ہے کیونکہ عقلی روشنی اِس سوال کے صرف ایک ہی پہلو یعنی تواریخی پہلو کا فیصلہ کریگی۔ اور یہ لازمی امر ہے کہ ہم اِس بحث میں تمام عقلی قواء کو بمعہ تمام علمی امداد کے کام میں لائیں مگر یہ بھی یاد رہے کہ جس بات پر محض عقلاً غور کیا جاتا ہے وہ مسیح کی پوری حقیقت نہیں ہے یعنی مسیحیت کی کامل بنیاد نہیں ہے کیونکہ مسیح کی حقیقت ضمیر کی حقیقت بھی ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اِس بنیاد میں اخلاقی باز پُرس اور اخلاقی انتخاب اور وعدہ اور تجربہ بھی شامل ہے۔ اور یہ باتیں بھی اُسی طرح صدق دِلی سے قبول کرلینی چاہئیں جس طرح کہ دوسری بات (یعنی تواریخی صداقت) قبول کیجائے۔ جس طرح مسیح کی حقیقت اپنے تواریخی پہلو کی تحقیق میں یہ طلب کرتی ہے کہ جس طرح دیگر تواریخی سوالات کی تحقیق کے وقت عقلی تعصب دور کیا جاتا ہے اُسی طرح اسپر غور کرتے وقت بھی عقلی تعصب دور کیا جائے اُسی طرح وہ اپنے دوسرے پہلو میں یہ طلب کرتی ہے کہ ایک خالص ضمیر اور ایک تابعدار مرضی سے اس تحقیق میں کام لیا جائے۔ اب چونکہ اس بات کے دو پہلو ہیں لہذا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اگر آپ حقیقی اور پورے طور پر مسیحیت پر غور کرنا چاہیں تو اس طرح کریں کہ پہلے اس کا مطالعہ عقلی نکتہ چینی کے ساتھ کریں کیونکہ یسوع ایک تواریخی حقیقت ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایسی ضمیر اور مرضی سے اُسپر غور کریں جو اخلاقی اثر اور ہدایت کو قبول کرنے کو تیار ہوں کیونکہ یسُوع دلکے اخلاقی تجربہ کی بھی حقیقت ہے پس اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ مسیحی مذہب کیا ہے تو آپ پر لازم ہے کہ آپ دونوں صورتوں میں صاف دلی اور وفاداری سے کام لیں۔ اگر آپکی تحقیق حقیقت المسیح کے متعلق کوئی تاریخی بات پیش کرے تو آپکو ایک خالص عقل کی ضرورت ہوگی۔ پر اگر آپکی تحقیق آپکو کسی اخلاقی انتخاب یا اخلاقی فیصلہ کے سامنے لاکھڑا کرے اور ایسا ضرور ہوگا کیونکہ مسیح جس طرح تواریخی

حقیقت ہے اُسی طرح ضمیر کی حقیقت بھی ہے) تو آپکو اُس وقت ایک خالص مرضی
کی ضرورت ہوگی تاکہ آپ اُس بات کو قبول کریں۔ یہ بات اُس مضمون کی خاصیت سے
جس کی تحقیق مدنظر ہے خود بخود ہویدا ہے۔ یعنی اُس کے دوطرفہ پہلو سے کہ وہ خارجی
بھی ہے اور باطنی بھی ہے یہ بات بخوبی عیاں ہے۔ پس لازم ہے کہ یہ بات ہمپر خوب
روشن ہو جائے۔ ہم یاد رکھیں کہ اگر ہماری مرضی اخلاقی طور پر ایسی ہے کہ وہ اخلاقی
باتوں سے بھاگتی اور اُنکے قبول کرنے میں بادیانت نہیں ہے تو ہمپر یہ بات کبھی ظاہر
نہ ہوگی کہ مسیحی مذہب کیا ہے اور ہم ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیں کہ اس کی وجہ یہی
ہے کہ حقیقت المسیح جس میں مذہب کی بنیادیں موجود ہیں نہ صرف تاریخی حقیقت
ہے بلکہ ضمیر کی حقیقت بھی ہے پس ہمیں حقیقت کے سامنے اخلاقی اور
عقلی دونوں طرح کی دیانتداری لیکر آنا چاہیئے۔ یعنی ہمیں صرف ایسی
عقل ہی کے ساتھ نہیں آنا چاہیئے جو تاریخی حقیقتوں کو قبول کرتی ہے بلکہ
ایسی مرضی کے ساتھ بھی جو اخلاقی باتوں کے قبول کرنے میں بادیانت ہو۔
اگر ایسا نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ہماری تحقیق پر شروع ہی سے ناکامی کا فتوےٰ
لگا ہوا ہے۔ اور جب ہم اِس بات کی تاکید کرتے ہیں تو ہم اُس بات کی
پیروی کرتے ہیں جو مذہب کے عظیم اُستاد نے اپنی زبان مبارک سے خود بیان
فرمائی تھی۔ کیونکہ یسُوع نے ایسے آدمی کے ساتھ جس کی عقل عروج کے
زینہ تک پہنچی ہوئی ہو یا جو علم تاریخ میں ماہر ہو کوئی وعدہ نہیں کیا۔
اُس نے اس آدمی کے ساتھ جو کہ "اُس کی مرضی پر چلنا چاہتا ہے" یہ وعدہ
کیا ہے کہ وہ "اُس کی تعلیم کو جانیگا"۔

تیسرا باب

اِس حقیقت کا پہلا مطلب

مسیح کا مطلب ایک بڑی وسیع بات ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام تاریخ میں اور ہر فرد کے جُداگانہ تجربہ میں بمنزلہ بنیاد کے ہے جسپر ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے جس کی نسبت ارسطو کہہ سکتا کہ یہ ایک کہانی ہے جو ایک بھدی صورت میں منظوم کیگئی ہے۔ اگر انسانی تاریخ کچھ مطلب رکھتی ہے اور اگر روحانی تجربہ کچھ مطلب رکھتا ہے تو یقیناً یسُوع کی حقیقت بھی کچھ مطلب رکھتی ہے۔ اتنی بڑی حقیقت کے ضرور بڑے بڑے مطالب ہونے چاہئیں اور اگر انجام کار ہم یہ دیکھیں کہ یہ مطالب اِس درجہ تک ہماری سمجھ کی رسائی سے باہر ہیں کہ ہم اُنکا پورا پورا بیان بلکہ اظہار بھی نہیں کرسکتے تو ہم متعجب نہ ہوں ؞

گو وہ سوال جو حقیقت المسیح کے مطالب سے وابستہ ہے نہایت وسیع ہے تاہم اُس کا جواب دینا شروع کرنا مشکل نہیں ہے۔ مسیح کی حقیقت کچھ ایسے مطالب رکھتی ہے جو واضح اور صاف اور سادہ ہیں۔ اور بہت لوگ ہمارے ساتھ اتفاق کرینگے اگر ہم یہ کہیں کہ اِن مطالب میں سے پہلا مطلب وہی ہے جو اخلاقی زندگی اور سیرت سے علاقہ رکھتا ہے ؞

یہ بات توکسی قدر اُس وقت بھی ظاہر کیگئی تھی جس وقت ہم حقیقت المسیح کا بیان پیش کر رہے تھے اُس وقت ہم نے دیکھا کہ وہ تواریخی طور پر ایک نمونہ ہے ایک اعلےٰ درجہ کا بیداغ نمونہ ہے اور پھر یہ بھی دیکھا کہ وہ حقیقت ضمیر کے باطنی احاطہ میں ایک ایسا اخلاقی حاکم ہے جو شخصیت سے خاص علاقہ رکھتا ہے اور اُسپر اپنا سکہ جماتا ہے جو آدمی مسیح کی حقیقت کے لیئے اپنا دِل اور ضمیر کھولتا ہے وہ ضرور یہ محسوس کرتا ہے کہ مجھے نیک آدمی بننا چاہیئے اور کہ اگر میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اور اُس کی باہمی رفاقت قائم رہے تو ضرور ہے کہ میں زیادہ نیک آدمی بنوں۔ اُس کے قصور اور اُس کے فرائض ایسے طور پر اُس کے سامنے آتے ہیں کہ آگے کبھی ایسے طور پر نہیں آئے تھے۔ حقیقت المسیح کا مقصد چاہے کچھ اور بھی ہو پر اس میں شک نہیں کہ یہ تو ضرور ہی ہے۔ اور آدمی خوب جانتا ہے کہ کسی اور آدمی کو جانفشانی سے ظاہر کرتے وقت اِس مقصد کو نظر انداز کر دینا سخت گمراہی ہے۔ لاریب حقیقت مسیح کا ہمارے لیئے یہ مطلب ہے کہ ہم اپنی زندگی اور چال اور سیرت پر ایک نئے پیمانہ کے مطابق نظر ڈالیں۔ اور کہ ہم اپنے سامنے نئے تصورات قایم کریں اور اُنہیں پورا کرنے کے لیئے قدم اُٹھائیں۔ جہاں یہ باتیں وجود میں نہیں آتی ہیں وہاں ہزار درجہ بہتر ہے کہ آدمی یہ مانے کہ میں اس حقیقت پر بالکل غور نہیں کرتا اور نہ کرونگا۔ پس مسیحی مذہب کا یہ خاصہ ہے کہ ہماری سیرت کا سویا ہوا خیال فوراً جاگ اُٹھتا ہے اور ایسی صورت میں کہ گویا وہ حقیقت مسیح کے معنوں کا ایک جزو اعلےٰ ہے۔ مسیحی مذہب چاہے اور کچھ کرے یا نہ کرے مگر اس میں شک

نہیں کہ اتنا ضرور کرنا ہے کہ ہمیں پہلے نئی سیرت پانے کی ترغیب دیتا ہے اور پھر اُس کے حاصل کرنے کی صورت بھی بتاتا ہے کیونکہ اگر یہ نہ بتائے تو پہلی بات بالکل بیفائدہ ہوگی۔ اب ہمیں تھوڑی دیر کے لئے اِن دونوں باتوں پر ذرا غور کرنا چاہئے ؀

لیکن اِن باتوں پر غور کرنے سے پہلے ہمیں اِس بات پر توجّہ کرنی چاہئے کہ یہ عنصر یسوع کے مذہب میں کیسا توجّہ طلب اور کیسا پُر اثر عنصر ہے۔ یہ بات کہ مذہب کا تعلق سیرت کے ساتھ خاص ہے ہمارے لئے عام ہوگئی ہے یعنی ہم آج یہ کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا چاہئے مگر اُس وسیع دنیا کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی جس کے درمیان مسیحی انجیل نے آنکھ کھولی۔ رومی سلطنت کی تہذیب میں جو کہ انگریزی تہذیب سے بھی کئی باتوں میں زیادہ وسیع تھی۔ مذہب بالکل اخلاقی باتوں سے جدا تھا۔ قدیم یونان اور روم کے کاہن اور ذاکیہ کبھی ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ بنی آدم کو پاک زندگی کی طرف راغب کرنا اور اُس کی تلاش میں اُنکی مدد کرنا ہمارے فرض کا ایک حصّہ ہے۔ پس لوگوں کی ظاہری اور باطنی زندگی سخت دلی اور ظلم سے مملو تھی اور ایسی بدی میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ہم اُس کا بیان بھی نہیں کرسکتے۔ لیکن اُن کا مذہب اِس حالت کے برخلاف کچھ بھی نہیں کہتا تھا۔ بلکہ برعکس اسکے یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ مذہب کے راز بدیوں پر پردہ ڈال دیتے تھے اور کاہن وغیرہ قبیح قسم کی شرارتوں کی اجازت دے دیا کرتے تھے۔ یہ جُدائی جو مذہب اور اخلاق کے درمیان اُس زمانہ میں پائی جاتی تھی مسٹر لیکی صاحب کے قول کے مطابق اس عجیب بات کا حل پیش کرتی ہے کہ کیوں اُس زمانہ کے فلسفانہ مزاج معلمانِ اخلاق نے مسیحی مذہب کے اظہار کی طرف ایسی کم توجّہ کی

کیونکہ امید تو یہ تھی کہ مسیحی مذہب قطع نظر علم الٰہی کے اعتقادات کے محض اس حیثیت سے کہ قوانین اخلاق کا مجموعہ ہے ضرور سنجیدہ لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیگا۔ پر ہم اپنی قیاس کی آنکھ سے ان فیلسوفوں کو جو اخلاقی باتوں کی نسبت بڑے سرگرم تھے یہ کہتے ہوئے سُنتے ہیں "کیا یہ مذہب نہیں ہے؟ مذہب کو اخلاقی زندگی کے ساتھ کیا واسطہ ہے"؟ ہاں اسی طرح پلوٹارک اور سنیکا اور اپکٹیٹس اور مرقس آریلی ایس جیسے لوگ استدلال کیا کرتے تھے اِن ذیشان معلمانِ اخلاق کی آنکھوں کے سامنے وہ بات آن موجود ہوئی جسے تمام تاریخ میں ایک اعلےٰ اخلاقی نظارہ بننا تھا۔ مگر اُنہوں نے اُس کی طرف ایک نظر بھی نہ دیکھا۔ اُنہیں کس طرح معلوم ہوسکتا تھا کہ یہی مذہب اُنکی اُس فطری پیش بینی کو جو کہ وہ مذہب کی وسعت اور غرض کی نسبت قیاس کئے بیٹھے ہیں غلط ٹھہرائیگا۔ اور بڑے زور سے اور ذاتی صورت میں اپنے آپ کو اخلاق کے ساتھ شیر و شکر کرلیگا اور باقی سب باتوں سے زیادہ اور مقدم اسکا یہ مقصد ہوگا کہ لوگ ایک نئی اخلاقی سیرت پیدا کریں ؟ اگر اِس قسم کے خیالات ایک دم کے لئے بھی اُنکے تصورات میں دخل پاتے تو ضرور سنیکا کچھ نہ کچھ اُس مسیحی مذہب کی بابت تحریر کرجاتا جسکی بعض تعلیموں سے مِلتے جُلتے کئی دلچسپ خیالات اُس کی اپنی تصانیف میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور یقیناً تاریخ کے صفحے اِس بات سے صاف رہتے جو تاریخ کی دردناک باتوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے اور وہ یہ کہ مرقس آریلی ایس جیسا آدمی یسوع کے پیرووں کا ایذا رساں تھا اگر وہ مسیح کی اخلاقی تعلیم کی طرف راغب ہوتا تو اِس قسم کی کوئی واردات سرزد نہیں ہوتی ؛

ہم ان باتوں پر اور وقت صرف نہیں کرینگے۔ ہم اب یہ سوال کرینگے کہ وہ سیرت جو مسیحی مذہب دنیا میں لایا کیا ہے ؛

۱- مسیحی سیرت

مسیحی سیرت کا بیج مسیح کی اپنی سیرت ہے - وہی جیسا کہ ایک قدیم مصنف
نے کہا ہے اُسکا "زندہ قانون" ہے - پس پہلے یہ لازم ہے کہ ہم اُن خاص
صفتوں کا جن سے اُس کی سیرت مشتمل تھی ایک صاف سا نقشہ اپنے لیئے تیار
کریں - ہم اُنہیں خاص صفات اس لیئے کہتے ہیں کہ اُس میں اور بہت سی صفات
بھی پائی جاتی تھیں مثلاً دلیری - سچائی اور وفاداری جیسی صفتیں بھی پائی جاتی
تھیں مگر وہ خصوصیت کے ساتھ مسیحی نہیں کہلا سکتی ہیں - پس اُن پر اس جگہ
کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارا مقصد اس وقت یہ نہیں کہ ہم اُس
سیرت کے تمام پہلوؤں پر غور کریں جو مسیح نے اس دُنیا میں آکر ظاہر کی -
بلکہ یہ کہ ہم صرف اُنہیں کو پیش کریں جو صاف اور خاص طور پر مسیحی ہیں -
پس انہیں پر ہم یہاں دھیان لگائینگے ؛

ہماری رائے میں مسیح کی سیرت میں اس قسم کے چار اوصاف پائے
جاتے تھے - اور اُن میں ایک صفائی یا پاکیزگی تھی - ہم اس صفت کو خاص
صفت کہتے ہیں کیونکہ جیسا بیان ہوا - یسوع نہ صرف ایک بیداغ شخص تھا
بلکہ وہی ایک ایسا شخص تھا جس کی طرف تزکیہ باطنی اور پاکی سیرت کے
الفاظ منسوب کیئے جا سکتے ہیں اور بغیر کسی طرح کی قید یا شرط کے - غیر مسیحی
دُنیا کے اخلاقی اُستادوں اور بہادروں کے درمیان بہت لوگ ایسے پائے
جاتے ہیں جو نیکی کے بہت درجہ تک عاشق اور عامل تھے لیکن اُن میں سے
ایک بھی ایسا نہیں جس کی نسبت ہم یہ کہہ سکیں کہ اُس کے نزدیک ناپاکی
کا خیال بھی نفرت کا باعث تھا اور کہ اُس کے ساتھ بدی کا خیال بھی مربوط

کرنا آدمی کے دماغ کو لرزے میں ڈال دیتا ہے۔ مسیح ہی وہ شخص ہے۔ جس نے نیکی میں ایک ایسا جوش بھر دیا ہے جس کے سامنے نہ صرف بدی پر فتویٰ ہی لگتا ہے بلکہ وہ اس طرح جل جاتی ہے جس طرح آگ سے کوئی چیز جل جایا کرتی ہے۔ وہی وہ شخص ہے جس نے اخلاقی ماہیت کو ایسے نور سے بھر دیا کہ اُس کی تاب نہیں لائی جا سکتی اور اُسے پاکیزگی کی آگ سے ایسا روشن کیا کہ وہ نور کے لمعہ کی طرح جگمگ جگمگ کرتی ہے۔ یوں وہ صفت جسے ہم پاکیزگی کہتے ہیں یعنے وہ نیکی جو نہایت گہری اور تازہ اور گناہ کے خیال کو محسوس کرنے والی ہوتی ہے اُسی کے وسیلے انسانی سیرت کے اخلاقی تصوّر میں داخل ہوئی اُسنے نیکی کو ایک نئی چیز بنا دیا ہے ایسی چیز بنا دیا ہے جو رُوح کی صفائی کے لئے بمنزلہ ایک جذبہ کے ہے اُسنے اپنے لوگوں کو یہ دعا مانگنی سکھائی۔ ”اے خدا تو ہمارے دلوں کو ہمارے باطن میں صاف کر ہمارے دل ایسے صاف ایسے شفاف ایسے چمکیلے بنا جیسے وہ ندی ہوتی ہے جو پہاڑوں کے دامن میں بہتی ہے جس میں ساری ناپاک اور غلیظ چیزیں نیچے بیٹھی ہوئی ہوتی ہیں اور جو اپنے پانیوں کی سطح پر صرف آسمان کی خوبصورت اور دلپسند روشنی کا عکس ظاہر کرتی ہے۔ کس شخص نے گناہ سے بھری ہوئی رُوح کے سامنے نیکی کا ایسا تصوّر رکھا ہے؟ اور کس نے اُس کے حصول کی راہ بتائی ہے؟ اُسی نے ایسا کیا ہے۔ جس نے اپنے تجربے سے کہا ”مبارک وہ جو دِل کے پاک ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھینگے“۔

دوسری خاص صفت مسیح کی سیرت میں محبت تھی۔ اِس صفت کو بھی اُسکے حقیقی مسیحی معنوں کے مطابق اُسی نے ہستی کی شکل دکھائی ہے۔ اس بات کی شناخت بھی کہ محبت کیا ہے اور کہ اُسے انسانی زندگی میں کیا جگہ ملنی چاہئے

مسیح ہی کے ساتھ دُنیا میں آئی اُس سے پہلے کبھی اِس بات کا مطلب کسی نے نہیں سمجھا تھا۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یسوع سے جُدا انسانی ذات کو یہ تصور کہ محبت کیا ہے حاصل ہی نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اُس نے اُسے وسیع کر دیا۔ ایسا گہرا بنا دیا۔ اور ایسی بلندی تک پہنچا دیا کہ گویا بالکل ایک نئی بات پیدا کر دی۔ اُس نے اُسے وسیع کر دیا یعنی اُسے ایک عالمگیر چیز بنا دیا۔ وہ پہلے ایک محدود سی چیز تھی۔ چنانچہ افلاطون جیسے ذی رُتبہ اُستاد نے بھی غیر ملک کے باشندوں کے ساتھ خاص نفرت سے پیش آنے کو روا رکھا۔ بلکہ اُسکی تعریف کی۔ غیر ملکوں کے باشندوں کے لیئے جو لفظ استعمال کیا جاتا تھا وہ یونانیوں کے نزدیک وہی مطلب رکھتا تھا جو بربری رکھتا ہے۔ اور رومیوں کے نزدیک اُس کے وہی معنے تھے جو لفظ دشمن کے ہیں۔ پس گو قدما محبت سے واقف تو تھے تاہم یہ درست ہے کہ اُسکی عالمگیر وسعت سے واقف نہ تھے یسوع نے ہم کو یہ بتلا دیا ہے کہ محبت سب بنی آدم سے کرنی چاہیئے۔ اور یہ بات قدیم زمانے کی مجلسوں اور علماء کی جگہوں میں بھی مانی نہیں گئی تھی پس اُس نے نہ صرف محبت کے تصور کو وسیع کیا بلکہ اُسے گہرا بھی بنا دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ستوئیقی فلاسفر بھی کم از کم عالمگیر اخوت کے خیال تک جا پہنچے تھے تو ہم اسے مان لیتے ہیں۔ تاہم یہ کہنا درست ہے کہ ستوئیقی فلاسفر کے لئے وہ محبت جو یسوع میں سب انسانی بھائیوں کے لئے موجود تھی ایک نئی بات تھی۔ ستوئیقی فلاسفر کا خیال اُس رشتہ کی نسبت جو انسان اور انسان میں پایا جاتا ہے بہترین صورت میں ایک سرد مہر اور قیاسی سا ہوتا تھا۔ اور یہ بھی اس وقت ہوتا تھا جبکہ کوئی ستوئیقی فلاسفر بہت نرم دل ہوتا تھا اور ایسے آدمی اس فرقہ میں بہت ہی کم ملتے تھے۔ ستوئیقی بہت ہی پرہیزگار اور اپنے اوپر قابو رکھنے والا

آدمی ہوتا تھا۔ لیکن جو محبت مسیح بنی آدم سے رکھتا تھا وہ نہایت جوش سے بھری ہوئی تھی۔ جس محبت سے اُس نے محبت کی وہ اُس کے دل کی محبت تھی۔ اُس کے ہر کام اور اظہار میں گویا اُس کے دل کا خون حرکت کرتا تھا۔ وہ اُس محبت کے سبب سے جو وہ بنی آدم کے لیئے رکھتا تھا اُنکی بھلائی کے لیئے تڑپا کرتا تھا۔ اُن کے لیئے دُعا کیا کرتا تھا۔ اُنکے لئے محنت کیا کرتا تھا۔ اور آخرکار اُس نے اُن کے لیئے اپنی جان بھی دیدی واقعی یہ محبت ایک نئی محبت تھی جو پہلے کرسمس کی موسم سرما میں بہار کے سورج کی گرمی کی طرح اِس دنیا میں آئی۔ اور جس کی گرمی ابتک اِنسان کے دِل سے دور نہیں ہوئی۔ اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مسیح نے اُسی محبت کو جسے اُسنے ایسا عالمگیر اور پُرجوش بنایا زندگی کے لیئے ایک دستورالعمل بھی ٹھہرایا۔ بیشک تاریخ کے صفحوں میں بعض بعض عمدہ مثالیں خودانکاری اور جان نثاری کی ملتی ہیں۔ لیکن اُس نے محبت ہی کو ایک قانون بنایا اِنسانی زندگی کی رہبری کا ایک اصول۔ ہاں ہر شخص کی زندگی کا اصول اِس ہی کو ٹھہرایا۔ اُس کے لیئے جیسا محبت کرنا تھا اور وہ محبت کرنے کے سوائے اور کسی طرح کا جینا جانتا ہی نہ تھا۔ وہ محبت تھا پس اِن سب باتوں میں یسُوع نے محبت کے تصور کو ایسا نیا۔ ایسا وسیع ایسا گہرا بنایا اور ایسا سرفراز کیا کہ یہ کہنا عین بجا ہے کہ اُسی نے محبت کو پیدا کیا۔ دنیا نے اِس قسم کی محبت کو آگے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر اِس قسم کی محبت یعنی وہ محبت جو سب کے لیئے ہوتی اور سب کچھ کرتی اور زندگی کا دستورالعمل سمجھی جاتی ہے ہاں اگر اِس قسم کی محبت اِنسانی سیرت میں جگہ رکھتی ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ بات اُسی سے جاری ہوئی جسنے

دنیا میں فی الحقیقت محبت کے تصور کو از سرِ نو پیدا کیا ۔

تیسری خصوصیت یسوع کی سیرت کی معافی تھی ۔ البتہ یہ صفت محبت سے ہی پیدا ہوتی ہے تاہم ضرور ہے کہ اُس کا ذکر علیحدہ کیا جائے کیونکہ یہ صفت ایک تبدیلی ہے ۔ گو باقی سب تبدیلیوں سے جو اُس نے عالم اِخلا[illegible] ایک بڑی تو نہیں تاہم [illegible] ور اُبھری ہے کہ سب سے ممتاز ہے مسیح سے پہلے جو خیالات اِس کے بارے میں مروّج تھے وہ اُس کتبہ سے ظاہر ہیں جو پلوٹارک کے قول کے مطابق روم کے کیمپس مارشس میں سلا کی قبر پر کندہ تھا ۔ "میرے ساتھ نہ کسی دوست نے اس قدر مروت کی اور نہ کسی دشمن نے مجھے اِس قدر ضرر پہنچایا کہ میں نے اُسے سو چند ادا نہ کیا" معافی کے تصور سے تو متقدمین واقف تھے مگر اُس کے عملی اظہار کی توقع کسی سے نہیں کیجاتی تھی ۔ یسوع نے اُسے عمل کی بات بنا دیا ۔ وہ کینے اور بغض کی کدورت کو دل میں جمع نہیں کیا کرتا تھا ۔ وہ اپنے نقصانوں کے خیال کو تازہ نہیں رکھتا تھا وہ اُن باتوں کو جو صلح کی مخالف ہوتی تھیں اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا تھا ۔ اور کبھی ایک منٹ کے لئے بدلہ لینے کے خیال کو دل میں آنے نہیں دیتا تھا اور صرف یہی نہیں ۔ بلکہ وہ اُس طبیعت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا جو اُس دعا سے ٹپکتی ہے جو اُس نے صلیب پر اپنے دشمنوں کے لئے مانگی اور جس نے بہ نسبت کسی اور بات کے رومی صوبہ دار کو حیرت کا پتلا بنا کر سجدہ کرنے کو مجبور کیا "اے باپ اُنہیں معاف کر کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کرتے ہیں" کیسا انقلاب اِس میں نظر آتا ہے ۔ کتاب "اکسی ہومو" کا مصنف کہتا ہے کہ معافی کے اِس قانون نے بنی آدم پر ایسا اثر پیدا کیا ہے کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس

صفت کو مسیحی اخلاق کا کل طریق نہ کہیں تو کم از کم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسیحی اخلاق کا بنیادی حصہ ہے۔ اور کہ اگر مسیحی طبیعت کا ذکر کیا جائے تو اُس سے عموماً معاف کرنے والی طبیعت مراد ہوتی ہے ؎

پر ایک اور صفت بھی ہے جو مسیح کی سیرت میں پائی جاتی ہے وہ بھی ایسی ہی نئی اور خاص ہے جیسی کہ اور صفات ہیں اور وہ فروتنی ہے۔ اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ صفت بھی بالتخصیص مسیحی صفت ہے۔ غیر قوموں کے درمیان جس بات سے صلح کی بو آتی تھی وہ حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ اور اعلےٰ درجہ کے اخلاقی فرقوں کی اعلےٰ سے اعلےٰ خوبیاں بھی ذاتی غرور پر مبنی ہوتی تھیں۔ شاید کسی کو یسُوع کی فروتنی ایسی عظیم الشان صفت معلوم نہ ہو کہ اُس کا تذکرہ بھی اُس کی صفات کے ساتھ کیا جائے۔ مگر ایسا خیال کرنا اِس بات کو محسوس کرنے میں قاصر رہنا ہے۔ کہ یہ صفت اُس کی زندگی میں بڑا اعلےٰ رتبہ رکھتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ فروتنی ایسی صفت ہے جو اپنے تئیں ظاہر نہیں کرتی اور چونکہ وہ فروتنی ہے اس لئے وہ ایک ایسا پھول ہے جو ہمیشہ آنکھ سے چھپا رہتا ہے۔ سو ضرور ہے کہ فروتنی اُس پستی سے جو جان بوجھ کر اختیار کیجاتی ہے تمیز کیجائے پیتوسطین عموماً اِن دونوں کو ایک ہی بات سمجھا کرتے تھے۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ پستی جو قصداً اختیار کی جاتی ہے نمائشی دکھاوے کے لئے ہو۔ پس ضرور ہے کہ اگر ہم حقیقی فروتنی کو دیکھنا چاہیں تو اُس کی تلاش اُسی طرح کریں جس طرح کوہستان الپسز میں ایک کم یاب پھول کے لئے کیجاتی ہے مگر جب ہم اُسے کمال کی حالت میں پالیتے ہیں جیسا کہ مسیح میں پاتے ہیں تو وہ ہمیں کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہے ! اُس کا اظہار مسیح کی زندگی سے صرف اسی بات میں نہیں

ہو تا کہ وہ خود نمائی اور خود بینی کے خیالات سے مبرا تھا اور اپنی بڑائی کے اسباب کا متلاشی اور تعریف کا خواہاں اور شہرت کا طالب نہ تھا اُس کا حلم اِن باتوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اگر بنی آدم کے درمیان کوئی آقا گذرا ہے تو وہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ اُن کے درمیان ایسا تھا جیسے خادم۔ اگر کوئی شخص علمدار آدمیوں کا اُستاد گذرا ہے تو وہ تھا۔ تاہم اُس نے سامریہ کی جاہل عورت کے ساتھ بات چیت کرنیکو تضیع اوقات نہ سمجھا اور کبھی یہ نہ کہا کہ میری زندگی جس کا بہت سا حصہ غریبوں اور جاہلوں اور بے مذاق لوگوں کے درمیان کٹا رائگان گئی۔ ہاں وہ جو کہ تمام تاریخ میں سب سے بلند و بالا نظر آتا ہے لوگ اُس کو یہ کہکر یاد کرتے تھے کہ وہ محصول لینے والوں اور گنہگاروں کا یار ہے۔ یہ حلم تھا مسیح کا۔ یہ گویا حقیقی عظمت اور بڑائی کا ایک مکاشفہ تھا۔ بعض بعض مواقع پر قیصر اور نپولین کی شاہانہ خودی میں ایک قسم کی تاثیر اور کشش محسوس ہوتی ہے۔ یہ آدمی واجب طور پر خیال کر سکتے تھے کہ ہم عام مٹی سے نہیں بنے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ دیگر اشخاص فقط انکی عظمت کو دوبالا کرنے کو پیدا کیئے گئے ہیں۔ تو بھی ہم یسوع ہیں جو ان دنیا کے فاتحوں کی نسبت کہیں زیادہ اپنے ابنائے جنس سے بلند تھا اور جو جانتا بھی تھا کہ میں اُنپر غالب ہوں کیونکہ اُس نے خود فرمایا "تم مجھے خداوند خداوند کہتے ہو اور تم ٹھیک کہتے ہو کیونکہ میں ہوں بھی" ہاں اسی فروتن یسوع ہیں ہم وہ چیز پاتے ہیں جو ہمپر ایسی تاثیر کرتی ہے کہ ویسی تاثیر دنیا کے بڑے بڑے پہلوان اور فاتح نہیں کرتے اور ہم سے اُس تعظیم کی نسبت جو ہم ایسے لوگوں کو دیتے ہیں کہیں زیادہ گہری تعظیم لیتی ہے۔ یسوع قدرت رکھتا تھا مگر اُس نے اُس قدرت کو ایک فروتن خدمت سے بپتسمہ دےئے رکھا تھا۔ گو وہ تمام دنیا کا بادشاہ

تھا تاہم وہ اپنے ماتحتوں کے درمیان بھی ایک حقیر آدمی تھا۔ گو وہ خداوند تھا تاہم وہ خادم تھا اور ایسا بنکر اُس نے ہمیں زندگی کی حقیقی عظمت اور حشمت سے آگاہ کر دیا۔ فروتنی اِس کی زندگی کی اعلےٰ فتوحات میں سے ایک فتح تھی۔ اور وہ معافی بخش صفت کے ساتھ ملکر اُس کی زندگی کی ایسی نئی صفت بنگئی جس کی مثال آگے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔ اور آج بنی آدم کے درمیان شاید کوئی اور صفت زیادہ صفائی سے اِس بات کی خبر نہیں دیتی کہ انسانی سیرت کو ایک نیا اثر موثر کر رہا ہے جیئی وہ روح دے رہی ہے جس نے اُس سے جو اپنے دل میں حلیم اور خاکسار تھا تعلیم پائی ہے اور جو اپنے اندر اسی مزاج کو پیدا کر رہی ہے جو کہ مسیح یسوع میں بھی تھا۔ کیونکہ نفسانی آدمی میں بہت درجہ تک وہ مزاج پایا جاتا ہے جو اِس مزاج کو ناپسند کرتا اور اِس کی مخالفت میں اُٹھتا ہے لیکن یہ فروتنی مسیحی مزاج کی ایک خاص خاصیت بنجاتی ہے۔ اگستن لکھتا ہے "کہ مسیحی تربیت کی قریبًا ساری ماہیت فروتنی ہی ہے"۔

اب ہم نے دیکھا کہ مسیح کی خصلت کی چار خاص صفتیں ہیں اور وہ پاکیزگی محبّت۔ معافی اور فروتنی ہیں۔ کوئی شخص جو اِن صفتوں کو اپنے سامنے نہیں رکھتا حقیقت المسیح پر ایسا غور نہیں کرتا جیسا کہ کرنا چاہئے۔ نہ وہ تواریخی طور پر اُس کی زندگی اور تعلیم کے حال پر مناسب غور کرتا ہے۔ اور نہ اُن اخلاقی سوالوں پر کافی غور کرتا ہے جو حقیقت المسیح سے دِل کے اندر پیدا ہوتے ہیں ماسوائے اور باتوں کے مسیحی مذہب بالتخصیص اور بتاکید یہ بتاتا ہے کہ مسیحی ہونا پاک بننے۔ محبّت کرنے۔ معاف کرنے اور حلیم بننے کا نام ہے۔ پس یسُوع کے یہ اخلاقی معنے جو زندگی اور سیرت کے ساتھ ایسا گہرا

تعلق رکھتے ہیں نظر انداز نہیں کئے جاسکتے اور نہ ہم اُنسے کنارہ کش ہوسکتے ہیں۔ پر
اگر ہم نہ اُنکا انکار کرسکتے ہیں اور نہ اُنسے کنارہ کش ہوسکتے ہیں۔ تو بتائیے کہ ہم انہیں کس
طرح حاصل کریں! یہ کہنا کہ ایسا بننا چاہئے آسان بات ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ
میں کس طرح اپنے دل کو صاف کروں۔ محبت کی نسبت خامہ فرسائی کرنا بڑا دلچسپ
کام ہے۔ مگر خودغرضی سے بالکل چھوٹ جانا کیسا مشکل کام ہے۔ معافی کے گن گانا بڑی
عمدہ بات ہے۔ پر جب مجھے نقصان پہنچتا ہے یا کوئی مجھے دُکھ دیتا ہے تو میں دیکھتا ہوں
کہ اُس نقصان یا دُکھ کو بھول جانا انسان کی فطرت ہی میں داخل نہیں ہے۔ دکھاوے
کیلئے حلیم اور فروتن بنجانا مشکل نہیں ہے مگر حقیقت میں حلیم بننا بڑا مشکل کام ہے
اور ذرا سا عملی تجربہ اور مشاہدہ اس بات کو ہم پر ظاہر کردیتا ہے کہ یہ باتیں آپ
ہی آپ ہم میں پیدا نہیں ہوتی ہیں اور نہ بڑھتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ بیشک
وہ ایسے تصورات ہیں جنکی ہم تعریف کرتے ہیں مگر اُنہیں پورے پورے طور
پر عمل میں لانا ہمارے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ ہم زندگی کے میدانوں
میں بڑے پاکیزگی اور محبت اور معافی اور حلیم کی اونچی چوٹیوں کا ذکر کیا کرتے
ہیں۔ مگر جب اُنپر چڑھنے کا موقعہ آتا ہے تب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی فطرت
کیسی لنگڑی اور کمزور ہے اور اُنپر چڑھنے کے لئے نارضامند ہے بلکہ مخالفت
کرتی ہے۔ کوئی شخص جو اپنی حالت سے آگاہ ہے اسکا انکار نہیں کرسکتا۔

مگر باوجود اِن مشکلات کے کئی خدا کے بندے اِن چوٹیوں پر پہنچ گئے ہیں
کوئی شخص مسیحی صدیوں میں سے بغیر اس بات کو محسوس کئے نہیں گذر سکتا
کہ یسوع نے نہ صرف اِس قسم کی سیرت کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا بلکہ باوجود
انسانی فطرت کی مخالفت کے اُس کا منشا یہ تھا کہ یہ سیرت بہت درجہ تک
عمل میں بھی نظر آئے۔ پس بنی آدم نے مسیح سے صرف یہی نہیں سیکھا کہ سیرت

کیا ہے۔ بلکہ اُس سے یہ بھی سیکھا ہے کہ ایسی سیرت اُنکو حاصل ہو سکتی ہے
یہ مسیحی سیرت جو پاک اور پُر محبت اور معاف کرنے والی اور حلیم ہوتی ہے ایک
ایسے درجہ تک جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا بہت لوگوں کو دستیاب ہو چکی ہے۔
ہمیں یقین ہے کہ ہم میں سے بہتوں نے اُسے دیکھا ہے ثانیاً ہم نے اُسے
اُن زندگیوں میں معائنہ کیا جو اب گذر گئی ہیں مگر ہمارے لئے بطور پاک میراث
کے مسیحی سیرت کی حقیقت اور خوبصورتی کا یقین جسے کوئی چیز محو نہیں کر سکتی
چھوڑ گئی ہیں۔ پس وہ سیرت جو مسیحی سیرت ہے گو فطرتی نمونہ نہیں ہے تاہم
ایک حقیقت ضرور ہے ۔

پر یہ حقیقت ایک ایسی حقیقت ہے جو تشریح طلب ہے۔ کس بات
نے بنی آدم کو پاک اور پُر محبت اور معاف کرنے والے اور فروتن بنایا؟
وہ کیا بات ہے جو مجھ میں بھی یہ سب خوبیاں پیدا کر سکتی ہے؟ مسیحی سیرت کا
فقط تصور حاصل کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ قدرت
کیا ہے اور کہاں ہے جو ان باتوں کو انسانی نیچر میں پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ہم
اُس قدرت کو بھی مسیح کی حقیقت میں پاتے ہیں؟

۲۔ اخلاقی محرک

ہمارے عزیز بزرگ ہنری ڈرمنڈ مرحوم جنکی اپنی ہی سیرت اُن لوگوں کی
جو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مسیحی سیرت انسانی فطرت میں پیدا ہو سکتی ہے
ایک عمدہ اور صاف نظیر تھی اپنے چھوٹے سے رسالے موسومہ "تبدیل شدہ
زندگی" کے شروع میں ہکسلے صاحب کے یہ الفاظ اقتباس کرتے ہیں "میں

کہتا ہوں کہ اگر کوئی اعلےٰ قوت اس بات کا وعدہ کرے کہ وہ مجھ میں ہمیشہ سچائی کے خیالات پیدا کریگی اور مجھ سے وہ کام کروائیگی جو درست ہو اور یہ شرط بھی کرے کہ میں ایک گھڑی کی طرح بنجاؤں گا اور مجھے ہر صبح کو گھڑی کی طرح چابی دیجایا کریگی تو میں فوراً اس بات کو قبول کرلوں گا"۔ یہ لفظ اقتباس کرکے ڈرمنڈ صاحب فرماتے ہیں "جو بات ہکسلے صاحب چاہتے ہیں میں اس وقت وہی پیش کرتا ہوں۔ اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔ اور میں کہتا ہوں کہ "بغیر گھڑی کی طرح" بننے کے مقصد حاصل ہو جائیگا۔ یہ بڑا پُرفخر جواب ہے کیا یہ صحیح بھی ہے؟ کیا حقیقت مسیح میں کوئی معنے ایسے مخفی ہیں جنسے یہ بات ممکن ہو سکتی ہے؛

اس سوال کا جواب دیتے وقت جن باتوں سے ہمیں خبردار رہنا چاہئے اور جن سے اجتناب کرنا لازمی امر ہے۔ وہ عدم حقیقت اور مبالغہ ہیں۔ جب کوئی شخص تواریخی حقیقتوں پر غور کرتا ہے اُس وقت ان خرابیوں کو محسوس کرنا بہت آسان کام نظر آتا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص باطنی اخلاقی قوت جیسے مضمون پر غور کرتا ہے تو وہ ان خرابیوں میں بآسانی گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی تعلیم میں ایک طرح کی شمبر مخفی ہوتی ہے۔ خصوصاً اُن باتوں میں جو تجربہ سے علاقہ رکھتی ہیں۔ اور ہمیں اور کوئی ایسا وقت معلوم نہیں جس میں ضمیر ایسی خراب ہوتی ہے جیسی اُسوقت ہوتی ہے جبکہ آدمی اس مضمون پر گفتگو کرتے وقت بے پروائی سے بولتا اور ایسے دعوے پیش کرتا ہے جو حقیقی واقعات پر مبنی نہیں ہوتے؛

پس پہلا سوال جو ہمیں کرنا چاہئے صاف لفظوں میں یہ ہے کہ وہ محرک کیا ہے جو مسیحی سیرت کے اظہار میں نمایاں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب بظاہر صاف اور سادہ سا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے لئے ہماری پسند یا ہماری مرضی ایک محرک ہے۔ یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ محرک

جوش انگیز نمونہ کی قدرت میں ملتا ہے یا ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ کسی مضبوط حکم میں پایا جاتا ہے لیکن اِس قسم کے جوابات اُس وقت کافی ہوتے ہیں جبکہ ہم عام قسم کے اندازوں کے مطابق سیرت پر غور کرتے ہیں۔ لیکن اُس وقت تسلی بخش نہیں ہوتے جبکہ سیرت کی طاقتوں کی تلاش اُنکے اعلےٰ سے اعلےٰ اور نہایت گہرے اندازوں میں کرتے ہیں۔ یہ ایسے محرک نہیں ہیں جن سے پاکیزگی۔ محبت۔ معافی اور حلم پیدا ہوں۔ مثلاً ہماری پسند اور ہماری مرضی وہ محرک نہیں ہے کیونکہ ہمیں اکثر اوقات رسول کے ساتھ متفق ہو کر کہنا پڑتا ہے "جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا پر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کر لیتا ہوں" اور نہ ہی نمونہ وہ محرک ہے کیونکہ ہمیں ایک رومی شاعر کے ساتھ ہم آواز ہو کر ماننا پڑتا ہے "میں اچھی چیز کو دیکھتا اور اُسے پسند کرتا ہوں لیکن میں بدتر کی پیروی کرتا ہوں"۔ اور اسی طرح حکم بھی اُن اخلاقی خوبیوں کو جو مسیحی اندازے اور نمونہ میں شامل ہیں حاصل کرنے میں بے تاثیر رہتا ہے پس وہ محرکانہ طاقت جس کی تلاش ہم اِس وقت کر رہے ہیں ضرور ان باتوں سے بڑھکر ہے۔

اب وہ کیا چیز ہے جو اِن سب سے بڑھکر ہے؟ اگر صرف پسند یا مرضی یا نمونہ یا حکم سیرت کو سب سے اعلےٰ اور سب سے گہری صورت یعنی مسیحی صورت میں پیدا نہیں کر سکتے تو کونسی قوت ہے جو کر سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسی رُوح تم میں ہوگی ویسی ہی تمہاری سیرت بھی ہوگی شاید اِس کو مختصر سی تعریف کے وسیلے بیان کرنا آسان نہ ہو۔ لہٰذا ہم اپنے مطلب کو ایک نظیر کے وسیلے واضح کرینگے آپ حب الوطنی کی مثال لیں۔ اور غور کریں کہ وہ کیا چیز ہے جو حب الوطنی کی صفت کو پیدا کرتی ہے؟ ہماری مرضی یا ہماری پسند اِس صفت کو پیدا نہیں کرتی ہے یعنی اگر ہم اِسے ایک عمدہ اور نفیس صفت

سمجھکر پسند کریں تو اس سے حب الوطنی کی سیرت پیدا نہیں ہوگی نیلسن یا واشنگٹن
کے کاموں یا عادتوں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے نقل کرنے سے یہ سیرت
پیدا نہ ہوگی - اور نہ اِس سیرت کو سرکار کا حکم پیدا کرسکیگا - فقط وہی بات
اِس سیرت کو پیدا کریگی جس میں یہ سب باتیں شامل تو ہونگی مگر وہ پھر بھی
اِن سب سے گہری اور بلند ہوگی - اور وہ یہ کہ ہم میں وہ رُوح پیدا ہونی
چاہیئے جسے حب الوطنی کی روح کہتے ہیں - لوگوں میں اِس روح کو پیدا
کرو اور اُسے اُنکے اندر قیام کرنے دو اور بس - پھر یہ سمجھو کہ حب الوطنی
کی صفت اُن میں آگئی اور زندگی میں اپنے تئیں ضرور ہی ظاہر کریگی اور
آپ ہی آپ ظاہر کریگی - یہی حال اور ہر طرح کی اعلیٰ اور گہری سیرت
کا ہوتا ہے - وہ کسی کارخانہ میں گھڑی نہیں جاتی - اور نہ کسی طریق کی
پیروی سے پیدا ہوتی ہے - وہ رُوح سے پیدا ہوتی ہے - اور چونکہ وہ
اُس روح سے پیدا ہوئی - لہذا جو کچھ وہ روح چاہتی ہے سو ہی اُس سے
کراتی ہے ؞

اب اگر یہ بات حب الوطنی جیسی صفت پر صادق آتی ہے تو ہزار درجہ
زیادہ زور سے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہی بات مسیحی سیرت پر بھی
عائد ہوتی ہے حب الوطنی واقعی ایک عمدہ اور تعریف کے قابل بات ہے -
تاہم اس قدر بلند نہیں کہ اُسے مختلف انسانی وسائل کے ذریعہ سے حاصل
نہ کرسکیں - لیکن پاکیزگی اور محبت اور معافی اور فروتنی کی روح کیسی اونچی
ہے کیسی ہماری رسائی سے باہر ہے ؟ ہم اِن صفتوں کے سایہ تک بھی
نہیں پہنچتے - کون انکی حقیقت اور مغز کو حاصل کرسکتا ہے ؟ اگر مسیحی اخلاقی
نمونہ کے سفید پھول ایسے اونچے پہاڑوں پر کھلتے ہیں کہ وہاں ہمارے ہاتھ

اور پاؤں نہیں جاسکتے ۔ تو کیسے کہ وہ چمکتا ہوا سورج جس کی روشنی میں وہ
پھول اُگے کسقدر ہماری طاقت رسائی سے بعید ہوگا ؟ اگر ہم مسیحی سیرت کے
ظاہری کاموں کو نہیں کر سکتے تو فرمائیے کہ اُنکی رُوح کو کہاں پا سکتے ہیں ۔؟
تاہم اگر وہ بات جو پچھلے پیریگراف میں عرض کیگئی درست ہے تو وہ اکیلا
محرک جو اس قسم کی سیرت کو پیدا کر سکتا ہے یہ ہے کہ یسوع کی روح ہم میں
پیدا ہو اور نشو ونما پائے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے لیئے ایک مشکل برپا
کر لی ہے دیکھیں کس طرح اس کو عبور کر سکتے ہیں ✣

اب ہم وہ بات یاد رکھیں جو اس ضرورت کے متعلق کہی گئی تھی کہ ان
باتوں پر غور کرتے وقت ہمیں سچے دل سے حقائق نفس الامر کا لحاظ رکھنا
چاہیئے ۔ ہم اپنی گذرگاہ اخلاقی فصاحت پر نہ بنائیں کیونکہ ایسا کرنا بہت
آسان ہے بلکہ ایسی مشکل کو عبور کرنے کیلیئے تاریخ کے بعض قلمبند کیئے
ہوئے واقعات پر اپنے پل کو تعمیر کریں ✣

پہلی بات جس پر ہمیں خیال کرنا چاہیئے یہ ہے کہ یسوع مسیح خود یہ سمجھتا
تھا کہ لوگوں کو ایک نئی رُوح ملنی چاہیئے کیونکہ فقط اسی سے اُنکی اصلاح
ہو سکتی ہے چنانچہ اُس نے ایک محقق کو جسکا حال دلچسپی سے خالی نہیں فرمایا "جب
تک آدمی ازسرِنو پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا" اور اِس
سے وہ آدمی مراد تھا جو روحانی طور پر ازسرِنو رُوح سے پیدا ہوتا ہے
یسوع مسیح اس کو اصول اوّل سمجھتا تھا اور یہی سبب ہے کہ اِس دنیا میں
اخلاق کے متعلق اسکا مقصد اور مدعا یہ نہ تھا کہ صرف قوانین اخلاق کی تعلیم
دے یا صرف انہیں اپنے نمونہ میں ظاہر کرے بلکہ وہ اِس لیئے آیا تھا ۔
ربطابق اُسی کے اپنے ایک محاورے کے) کہ روح کا بپتسمہ دے ۔ اور

یہ بات کہ وہ اِس میں کامیاب ہوا اِس سے ظاہر ہے کہ اُس نے یوحنا اور پطرس اور مریم مگدلینی اور کئی اور اشخاص کو بالکل بدل دیا۔ ہاں پورے پورے طور پر اور واضح طور پر اُس نے اُن میں ایک نئی رُوح بھر دی۔ یعنی اُن میں اپنی پاکیزگی اور محبت اور معافی اور فروتنی کی رُوح بھر دی اور یوں اُنکو ایک نئی سیرت بخش دی ؞

اب ہم یہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ جتنے دن مسیح اِس دُنیا میں جیتا رہا اُتنے دِن یہ بات وقوع میں آئی کیونکہ ہر ایک بڑے آدمی کی رُوح اُن لوگوں میں داخل ہوتی ہے جو اُس سے مس پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بہادر شخص لوگوں کے ساتھ رہکر اُن میں بہادری کی رُوح بھر دیتا ہے۔ اِسی طرح ایک پاک روح بھی ہمیں پاک کر دیتی ہے۔ جبکہ ہم اُس کے سامنے ہر وقت حاضر رہتے ہیں۔ اور جب کوئی شخص اس بات پر غور کرتا ہے کہ یسوع کیسا عجیب شخص تھا تو وہ یہ بات بھی مان لیتا ہے کہ وہ لوگ جو اُس سے ملاقی ہوتے تھے اس کی آواز سنتے تھے اور اُس کی آنکھ کو دیکھتے تھے وہ صرف اُس کے الفاظ سے موثر ہوئے ہونگے بلکہ وہ فی الحقیقت اپنی ساری فطرت میں تبدیل ہو گئے ہونگے اور اُنھوں نے اپنے آپ کو اُس کی روح کے سپُرد کر دیا ہوگا۔ اگر نپولین اس قسم کا اثر اپنی فوج پر ڈال سکتا تھا تو ضرور ہے کہ یسُوع بھی اِس قسم کا اثر اپنے دوستوں پر ڈال سکتا تھا۔ لیکن اِس بات میں ایک قید لگی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ گویا روحوں پر اِس قسم کا اثر پیدا کرنے کے لئے اِس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اثر پیدا کرنے والا آدمی بذاتِ خود حاضر ہو۔ پس یہ بات شخصی تاثیر پر منحصر ہے۔ پس جہاں یہ شخصی عنصر موجود نہیں ہوتا وہاں یہ روحانی اثر

کافور ہوجاتا ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا ہے تو اُسکے ساتھ اُس کی تاثیر بھی معدوم ہوجاتی ہے۔ البتہ چند دن کے لئے اُن لوگوں کے دلوں میں رہتی ہے جو اُسے جانتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ زمانوں کے لیئے یادداشت اور نمونہ کے طور پر قائم رہے۔ پر اِس قسم کی تاثیر آدمی کے زندہ شخصی اثر کا محض ایک سایہ سی ہوتی ہے مگر وہ آپ وہاں موجود نہیں ہوتا۔ پس ضرور ہے کہ ہم نئے اور تازہ اثر کی تلاش کریں ؛

اب اس سے یہ ظاہر ہوا ہوگا کہ یہ تو ہم سمجھ گئے کہ یسوع جب تک اِس دنیا میں زندہ تھا وہ اُن لوگوں کے دلوں میں اور دماغوں میں اس نئی رُوح کو فی الواقع ڈال سکتا تھا (اور اِس لئے اُنہیں اِس مسیحی سیرت کے پانے کے لائق بناسکتا تھا) لیکن یہ سب کچھ صرف اُسی وقت ممکن تھا جبکہ وہ شخصی طور پر اُنکے بیچ میں زندہ اور حاضر تھا پر جب وہ اِس دنیا سے گذر گیا تو اُس وقت ہماری رائے میں اُس کے ساتھ اُسکا یہ اثر بھی کافور ہوگیا۔ پس ثابت نہیں ہوتا کہ اِس سارے بیان میں کوئی ایسی بات پائی جاتی ہے جو آج ہمارے اندر جنہوں نے کبھی اُسکا مُنہ نہیں دیکھا اور نہ کبھی اُس کی آواز سُنی۔ یہ نئی رُوح پیدا کرے ؛

لیکن عین اِسی جگہ ہم اُس نہایت عجیب بات کو دیکھتے ہیں جو نئے عہدنامے میں اور نیز تمام اخلاقی تاریخ میں لاثانی ہے ؛

یسُوع مسیح کے کلام میں جو کہ انجیلوں کے بیان میں قلمبند ہے (اور ہم یہاں انجیلوں کو محض تواریخی بیان سمجھینگے) ہم ایک عجیب بات اِس مضمون پر دیکھتے ہیں۔ یسُوع مسیح نے جیسا ہم بیان کرچکے ہیں اپنی زندگی

کے ایام میں بوسیلہ اپنی شخصیت کے ایک عجیب قسم کا روحانی اثر لوگوں کے دلوں پر ڈالا۔ پر اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب اُس کی زمینی زندگی خاتمے کو پہنچی تو اُس نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ اب وہ اثر معدوم ہو جائیگا یا کم ہو جائیگا بلکہ اُس کا یقین اس کے برعکس تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے اُس کے قائم رہنے بلکہ زیادہ ہونے کا وعدہ کیا اُسی روح کا جس سے اُسنے اُنکو بپتسمہ دیا تھا اور جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکی زمینی زندگی کے ساتھ کافور ہو جائیگی ؂

اُسی روح کی نسبت اُس نے بڑے پُر تاثیر کلمات میں کہا کہ پہلے کی نسبت زیادہ کثرت کے ساتھ دی جائیگی اور کسی طرح میری شخصیت کی موجودگی سے کم نہ ہوگی اور اپنے اِس مطلب کو یہ کہکر ظاہر کیا کہ میں جاتا نہیں رہونگا یعنی وہ بات نہیں جاتی رہیگی جو اُس کے شخصی مس سے پیدا ہوئی تھی۔ یہی بات ہے جو یسوع مسیح کی آخری باتوں کی ایک خاص خاصیت ہے۔ کسی اور آدمی کی تعلیم میں یہ بات پائی نہیں جاتی اُس نے اُسے اپنے آخری کلمات میں اِس طرح بیان کیا ہے "میں دُنیا کے آخر تک ہر روز تمہارے ساتھ رہونگا"۔ آپ اِن لفظوں پر ذرا غور کریں اگر یہ الفاظ ہمارے کسی پیارے دوست یا معتبر ہادی کے آخری الفاظ ہوں تو ہمیں نہایت افسوس ناک اور درد انگیز معلوم ہونگے۔ اور کیوں؟ صرف اِس لئے کہ وہ حقیقی طور پر اور کامل طور پر اور لفظی طور پر سچ نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ اِنمیں کچھ درجے تک ایک قسم کی شاعرانہ تاثیر موجود ہو لیکن اس سے بڑھکر نہیں ہم جانتے ہیں کہ کچھ تو ہمارے لئے باقی رہتا ہے مگر وہ صرف ایک یاد داشت

یا ایک نمونہ ہی ہوتا ہے۔ بیشک کچھ تو باقی رہتا ہے مگر وہ شخص خود نہیں رہتا اُس کی پیاری حضوری نہیں رہتی۔ اُس کا با قدرت شخصی اثر نہیں رہتا وہ آپ نہیں رہتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ معدوم ہو گیا۔ کہ وہ جو رُوح تھا مِٹ گیا۔ ہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ جیسا وہ کسی وقت یہاں تھا ویسا یہاں نہیں رہا۔ اور ہم اُس کی غیر حاضری کے سبب سے اپنے آپ کو زیادہ تنہا اور اور متاسف اور غریب محسوس کرتے ہیں۔ پس اگر کوئی ہمارا پیارا دوست یا پیشوا گذرتے وقت ہم سے یہ الفاظ کہہ جاتا کہ "میں ہر روز تمہارے ساتھ ہوں" تو وہ جیسا ہم نے اوپر کہا ہمارے لئے نہایت درد انگیز ہوتے۔ ہاں اگر ہمارا کوئی دوست ہمیں یہ کہکر چھوڑ جاے کہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں تو اسکی یہ بات نہایت درد انگیز ہوتی۔ مگر یسوع نے تو یہی آخری لفظ اپنی زبان سے نکالے تھے ؛

آؤ اب ہم نئے عہد نامے کی دوسری کتابوں کی طرف متوجہ ہوں اور ہم پھر کہتے ہیں کہ ہم اُنہیں الہامی کتابیں سمجھ کر اُنپر غور نہیں کرینگے بلکہ یہ سمجھکر کہ وہ تواریخی کتابیں ہیں۔ جب ہم اِس طرح اُنکی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کیا پاتے ہیں ؟ کیا ہم اُن میں ایک شخص کی عدم موجودگی کے متعلق جس کی تلافی کسی صورت سے نہیں ہو سکتی یہ درد آمیز احساس پاتے ہیں؟ کیا اس نالے کی آواز سُنتے ہی کہ وہ جو یہاں ہماری ہدایت کرنے کے لئے۔ ہم کو طاقت دینے کے لئے اور ہمیں جوش بھرنے کے لئے موجود تھا اب نہیں رہا ؟ یا ہم اِس افسوس ناک صدا کو سُنتے ہیں کہ ہاے وہ تو مر گیا اب ہم کیا کریں ؟ اِس نوحہ کی آواز نئے عہدنامے کی کتابوں میں سے ہمارے کانوں میں آنی چاہئے تھی لیکن ہم اِن کتابوں کے ہر ایک صفحے میں اِس کے بالکل برعکس پاتے ہیں۔ ہر ایک کتاب اِس گواہی سے معمور ہے کہ یسوع مسیح کے آخری الفاظ

کامل طور پر اور لفظی صورت میں پورے ہوئے ہیں۔ مگر اس کا اپنی زمینی زندگی کے اختتام کے نزدیک سب سے بڑا خیال یہ تھا کہ وہ جو کچھ اپنے بندوں کے نزدیک جیتے جی روحانی طور پر تھا۔ یعنی جس طرح اور جس قدر کہ وہ اپنی شخصی حضوری کے وسیلے بنی آدم کے لئے نصیحت اور نمونے سے بڑھکر تھا اُسی طرح اور اُسی قدر وہ اُنکے درمیان زندہ رُوح بنکر قایم رہیگا۔ ہم بڑے دعوے کیساتھ کہتے ہیں کہ نئے عہد نامے کے مصنفوں کا سب سے بڑا اعتقاد یا تعلیم یہی ہے۔ یسُوع مسیح کی رُوح اُنکو اُسی طرح تحریک میں لاتی۔ اُسی طرح یقین کے ساتھ اور براہِ راست اور پُرزور طور پر نئے سانچے میں ڈھالتی اور تبدیل کرتی ہے۔ جس طرح کہ یہ باتیں اُس وقت وقوع میں آتی تھیں جبکہ وہ زمین پر چلتا پھرتا اور اُن سے باتیں کیا کرتا تھا۔ واقعی یہ بات نئے عہد نامے کی کتابوں کا ایک بڑا خاصہ ہے۔ تمام دُنیا کے علم ادب میں یہ بات اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ پر نئے عہد نامے کے سب مصنف اِس بات پر متفق ہیں مثلاً یوحنّا رسول کے نزدیک یسوع مسیح ایک مرجھانے والا نمونہ نہیں ہے بلکہ وہ وہ ہے "جس نے ہمیں اپنی روح ہی سے دیا" اور مقدس پطرس جو یسوع مسیح سے اُس وقت جبکہ وہ زندہ تھا بخوبی واقف تھا موت کے بعد بھی اُسے اپنی باطنی زندگی میں اُس کی رُوح کے وسیلے جو اُس میں تھی موجود پاتا ہے اِسی طرح کے لفظوں میں مقدس یعقوب بھی اُس روح کی بابت بولتا ہوا کہتا ہے "کہ وہ ہم میں رہتی ہے" اور پولوس بھی یسوع کو گناہ پر فتح پانے میں ویسی ہی ایک فتحمند اخلاقی قوت محسوس کرتا ہے جیسی کہ اُس کی شخصی حضوری دنیا میں ہوتے ہوئے تھی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "زندگی کی روح نے مسیح یسُوع کے سبب (یونانی میں) ۔ ۔ ۔ ۔ گناہ سے آزاد کیا" ہمنے فقط

یہ چار حوالے پیش کئے ہیں۔ پر ہر شخص جو نئے عہدنامہ کا پڑھنے والا ہے جانتا ہے کہ اِس تعداد کا شمار بہت بڑھ سکتا ہے۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ سب سے بڑی توجہ کے لائق اور سب سے زیادہ صاف بات نئے عہدنامہ میں یہ ہے کہ جو کچھ مسیح زندگی میں تھا وہی موت کے بعد بھی ہے یعنی وہ موت کے بعد محض ایک مردہ سی یادگار نہیں بنا۔ بلکہ ایک زندہ روح کے طور پر اپنے شاگردوں کے دلوں میں آیا اور وہاں رہا۔ وہ آخری الفاظ جو اُسکی زبان سے نکلے ایک بے بنیاد وہمی بناوٹ نہ تھے کیونکہ وہ فی الحقیقت اُنکے ساتھ تھا۔ اُنکے بیچ میں اُس کی روح تھی۔ اُس کی قدرت اور حضوری اور شخصیت اُنکے ساتھ ایسی ہی موجود تھی جیسی کہ اُس کی زمینی زندگی کے وقت تھی ॥

اب اِن سب باتوں کا کیا مطلب ہے؟ اِن کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک بڑی پُرتاثیر گواہی اِس بات کی ہے کہ مسیح نے پہلے ہی سے دیکھ لیا کہ میرے مرنے کے بعد ایسا ہوگا اور ابتدائی مسیحیوں کا یہ مضبوط دعوےٰ ہے کہ ویسا ہی ہوا۔ اب کیا اِس بات کا صرف یہ مطلب ہے کہ ایک نیک اور بزرگ آدمی کا اثر دُنیا کی اخلاقی قوت کے ساتھ مِلکر اُس قوت کے حجم کو بڑھا دیتا ہے اور بس؟ کیا اِسکا یہ مطلب ہے کہ جب نئے عہدنامے کے مصنف یہ کہتے ہیں کہ یسوع اپنی روح کے وسیلے ہم میں رہتا ہے تو اِس سے اُنکی یہ مراد ہے کہ اُس کی باتیں اُنہیں ایک گہرے طور پر موثر کر رہی ہیں؟ جو لوگ پہلی بات کو مانتے ہیں وہ ایک بوسیدہ بات کے وسیلے تاریخ کی ایک نہایت قابلِ غور حقیقت کو حل کرتے ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ مسیحی مذہب اپنے بانی کی موت کے بعد فتحمندوں کی طرح سربلند ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یسوع اپنی روح کے وسیلے اپنے شاگردوں کے ساتھ نہ تھا تو مسیحی مذہب نے کِس طرح وہ کامیابی پائی جو

اُسے بعد میں نصیب ہوئی ؟ اور جو دوسری بات کو مانتے ہیں وہ نئے عہد نامہ کو تمام دنیا کی دینی کتابوں میں سب سے زیادہ فضول کہنے اور مبالغہ کرنے والی کتاب بنا دیتے ہیں یعنی اُسے ایک ایسی کتاب بنا دیتے ہیں جو سب کتابوں سے بدترین کتاب ہے - کیونکہ اُس روحانیت سے جو حقیقت پر مبنی نہیں اور اُس دینداری سے جو واقعات کے بیان کرنے میں سچائی سے کام نہیں لیتی اور کونسی چیز بدتر ہے ؟ پر سوال پھر برپا ہوتا ہے کہ ہمارے لئے اِس کا کیا مطلب ہے کہ یسُوع ہمارے اندر اب بھی زندہ ہے ؟

پچھلے لکچروں میں سے ایک لکچر نے ہمیں کافی طور پر دکھا دیا ہے کہ یہ بات بالکل صاف ہے چنانچہ ہم نے دیکھا کہ حقیقت المسیح قدیم تاریخ کا صرف ایک تاریخی واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ اُس سے بڑھکر ہے - ہاں ہمنے دیکھا کہ وہ ایک باطنی حاکم ہے - اور کہ وہ کبھی ہمارے دِل میں اپیل کرتا ہے اور کبھی جس طرح اپیل کرتا ہے اُسی طرح کسی بات کی ترغیب دیتا ہے - اب یہ کیا ہے ؟ کیا یہ کم از کم اِس علم کا شروع نہیں ہے کہ یسُوع ہمارے اندر ایک رُوح اور زندگی ہے ! ہر ایک آدمی خواہ وہ اُسے رد کرے یا اِسے قبول کرے اِس کا اقرار کرتا ہے ؁

اِس میں شک نہیں کہ یسُوع کی اپیل اور اختیار اور تاثیر کا مقابلہ بھی کیا جاتا ہے - کیا ہم میں سے کئی ایک نے (اگر ہم سچائی سے اپنے تئیں پوچھیں) یہ مقابلہ صاف صاف طور پر بڑی ضد اور اصرار کے ساتھ نہیں کیا ہے ؟ کیا ہم نے بعض اوقات اُس کے کسی کلمہ یا کسی نمونہ کو بڑے زور سے رد نہیں کیا ؟ کیوں ہمنے ایسے زور و شور سے اُسے رد کیا ! کیا ضرورت تھی کہ ہم ایک ایسی نصیحت یا نمونہ کی جسے گذرے ہوئے انیس صدیاں گذر گئیں

ایسے زور شور سے مخالفت کرتے۔ ہم اس طرح سے ارسطو کا مقابلہ نہیں کرتے خواہ وہ ہم سے اخلاقی باتوں ہی پر مخاطب کیوں نہ ہو۔ ہم اُس کی تابعداری سے بآسانی انکار کر سکتے ہیں پر ہم نہیں کرتے۔ لیکن جب یسُوع ہم سے اپنے کلام یا نمونہ سے ہمکلام ہوتا ہے تو ہمیں فرمانبرداری کے لئے تیار ہونے کی بجائے بڑی صفائی اور پختہ ارادے کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ "نہیں ہم یہ بات نہیں مانینگے"۔ ہم پھر پوچھتے ہیں کہ اسکی تابعداری کا انکار کرتے وقت ہمیں کیوں اس قدر زور سے کام لینا پڑتا ہے؟ اس لئے کہ اُس کے فرمان سے انحراف کرنا آسان نہیں؟ آؤ ہم اپنے اس پُر زور مقابلے کی حقیقت سے یہ نتیجہ نکالیں کہ جس صداقت کا مقابلہ ہم کر رہے ہیں وہ حقیقی ہے۔ ہاں یہ حقیقت کوئی پُرانی اخلاقی نصیحت نہیں ہے اور نہ وہ ایک دور کا دھندلا نمونہ ہے۔ وہ ایک عملی اور زندہ حقیقت ہے۔ وہ رُوح اور زندگی ہے۔ وہ وہی مسیح ہے جو آج بھی اُسی روحانی اور شخصی حضوری کے ساتھ ہم کو ترغیب دے رہا ہے جس کے ساتھ اُسنے (جیسا کہ ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں) ایک نوجوان سردار یا سامریہ کی عورت کو دی تھی۔ کبھی کبھی ایسے وقت آتے ہیں جبکہ ہمارا کسی مسیحی صداقت کا انکار کرنا اُس جوش کے وسیلے جو اُس انکار میں ظاہر ہوتا ہے اس بات کو ثابت کر جاتا ہے کہ ہم محض ایک خیال یا نصیحت کا انکار نہیں کرتے بلکہ اُس حقیقت کا جو ایک خیال یا نصیحت سے کہیں بڑھکر ہے۔ کہ وہ حقیقت جس کا ہم انکار کرتے ہیں ایپکٹیٹس یا کسی اور اُس جیسے شخص کے تصورات و نصائح سے بڑھکر ہے۔ واضح ہو کہ ہمارے انکار کرتے وقت ہمیں ایک روح چھوتی اور تحریک اور ترغیب دیتی ہے۔ اور اسی لئے ہمارا انکار یعنی "نہیں" ایسا صاف ہوتا

ہے۔ گویا یہ بھی اس بات کی ایک گواہی ہے گو رضامندی سے نہیں دیجاتی کہ یسوع نصیحت اور نمونہ کی ایک مردہ سی روایت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمارے لئے ایک زندہ اور روحانی شخصیت کی حضوری ہو سکتا ہے ۔

اب اگر یہ بات ہمارے انکار سے ہمپر ظاہر ہوتی ہے تو ہم کس طرح کہیں کہ وہ ہمارے لئے اُس وقت روشن نہیں ہوتی جبکہ ہم اپنے تئیں اُسکے حوالے کردیتے ہیں؟ آؤ ہم ہر طرح کے اندھیرے اور انکار حقیقت سے بچے رہیں۔ اور اُس بات سے جو صاف اور عملی ہے شروع کریں۔ جب یسوع اپنی نسبت اس روحانی حقیقت کا ذکر کر رہا تھا وہ اُس وقت پُر راز چوٹیوں پر پرواز کر رہا تھا۔ تاہم اُس نے اِس حقیقت کو اُن باتوں سے مربوط کیا جو انسانی زندگی سے نہایت قریب ہوتی ہیں ۔ خصوصاً اُس نے اس حقیقت کو اپنے لفظوں کے ساتھ مربوط کیا۔ یعنی اپنے حکموں اور وعدوں کے ساتھ۔ چاہیئے کہ لوگ انہیں دیکھیں۔ انپر غور کریں۔ انہیں اپنی زندگی پر چسپاں کریں اور اُنکی حقیقت سمجھیں۔ اچھا پھر کیا ہوگا؟ پھر یہ ہوگا کہ جو آدمی ایسا کرتا ہے وہ دیکھیگا کہ میں لفظوں اور لفظوں اور لفظوں کے پڑھنے کی نسبت بہت کچھ زیادہ کر رہا ہوں۔ میں اپنی عقل اور ضمیر اور دل اور مرضی پر اندیکھی طاقتوں کے دروازے کھول رہا ہے ہاں وہ ایسی طاقتوں کے لئے دروازے کھولتا ہے جو اُسے ایسے طور پر روشن کرتی ہیں اور زندگی بخش دیتی ہیں اور صاف کرتی ہیں اور قدرت دیتی ہیں کہ وہ حیران رہجاتا ہے۔ اُس کا وہ دِن جو اس طرح گذرتا ہے گویا ایک روح میں گذرتا ہے۔ یعنی یسوع کی روح میں۔ کیا ہمنے اِس قسم کی رُوح کو اپنے آپ اپنے اندر پیدا کرلیا ہے؟ یا کیا اخلاقی نصیحتوں نے خواہ وہ کیسی ہی بلند

کیوں نہ ہوں اُسے ہمارے اندر پیدا کیا ہے؟ یقیناً وہی بات جو رسول اس کے متعلق پیش کرتا ہے صحیح ہے! وہ کہتا ہے ''اُس خداوند کے وسیلے سے جو روح ہے ہماری وہی جلالی صورت درجہ بدرجہ بنتی جاتی ہے'' صرف یسوع ہی ہاں صرف اُسی کی زندہ شخصیت ہمیں اُس کی روح دیتی ہے۔ روحانی علم ادب کا نہایت تعجب خیز اظہار ہماری اخلاقی تاریخ میں عیاں ہے اور ہم اُس کا بیان سوا اس کے اور کیا کرسکتے ہیں کہ دیگر تمام اخلاقی اور روحانی اُستادوں کی شخصیتیں بمعہ اُن سب باتوں کے جو انمیں پائی جاتی ہیں اُسوقت گذر جاتی ہیں جبکہ اُنکی زمینی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اِس عام قاعدہ سے فقط ایک ہی شخص مستثنیٰ ہے پس یسوع نمونہ اور نصیحت کے علاوہ وہی روح اب بھی دیتا ہے جو اُسنے اُس وقت جبکہ اِس دُنیا میں تھا اُن لوگوں کی روحوں میں بھر دی جو اُس سے ملاقی ہوتے وہ اب بھی ہمارے ساتھ ہے اسکی شخصی حضوری نے اپنی شکل تبدیل کرلی ہے مگر وہ قوت اور جوش جو شخصی حضوری میں ہوتے ہیں اُسی طرح اب بھی موجود ہیں۔ صورت فقط بدل گئی ہے یعنی وہ اب جسم میں ہمارے ساتھ موجود نہیں۔ مگر حقیقت اور اصلیت کے اعتبار سے وہ اب بھی ہمارے ساتھ ہے وہ روح ہے اور روح روح سے ملاقی ہوتی ہے۔ اور وہ روح بلکہ ہمیں کہنا چاہئے وہ مسیح (کیونکہ حقیقت میں روح ہی تو اُسکی شخصیت ہے) ہماری روحوں کو متاثر کرسکتا ہے۔ اور اگر ہماری روحوں کو یسوع کی روح سے ہدایت ملتی ہے تو ضرور ہماری روحیں اُس مسیحی سیرت کے تصور کی حقیقت تک پہنچ جائینگی جسے وہ اور کسی طرح نہیں پاسکتی ہیں ''خداوند'' جو ایک نئے اخلاقی پیمانہ کا دینے والا ہے ''روح'' ہے یعنی مسیحی سیرت پیدا کرنے والی ایک طاقت ہے ؎

پس سیرت کے حق میں حقیقت المسیح کا یہی مطلب ہے۔ اُسکا دُہرا مطلب

یہی ہے۔یعنی یسوع نہ صرف اُسکا نمونہ ہی ہے بلکہ وہ طاقت بھی جو اُسے اُس نمونہ تک پہنچنے کی توفیق بخشتی ہے۔یہ مطلب جو یسوع کی حقیقت سیرت کے متعلق رکھتی ہے ایسا ہے جس کی نظیر اخلاقی دنیا میں کہیں نہیں ملتی دُنیا کے اخلاقی اُستادوں نے یسوع کے مقابلہ میں سیرت کے سوال کو تسلی بخش صورت میں حل نہیں کیا ہے۔مثلاً اِس بات کے حل کرنے میں کہ اِنسان کا نیک بننا کسے کہتے ہیں اور کہ وہ اِس برکت کو کس طرح عملاً حاصل کرسکتا ہے ارسطو کے ابحاث اور بیکین کے مسائل اور سقراط کی خوبیاں اور گوتم کا نمونہ کیا کرسکتا ہے؟ اس معاملہ میں جو کچھ یسوع نے پہلے اپنے نمونہ اور تعلیم میں کر دکھایا اور پھر جو کچھ اِس سے بھی زیادہ عجیب طور پر اُس نے اپنی قائم رہنے والی شخصی وروحانی حضوری اور قدرت کے وسیلے سے کر دکھایا جبکہ اُس نے آدمیوں کو وہ روح دی جو ایکلی سیرت کو پیدا کرسکتی ہے اِن باتوں کے مقابلہ میں مذکورہ بالا اُستادوں کے نمونے اور ہدایتیں کیا چیز ہیں؟ اِس معاملے میں اُسی اکیلے کا نام سرفراز ہے؛

کیا یہ بات ہم میں سے ہر ایک کے لئے بڑی بات نہیں ہے؟ اور کیا یہ دُنیا کے لئے بھی ایک بڑی بات نہیں ہے؟ ہم اپنے سنجیدہ موقعوں پر اس بات کے قائل ہوجاتے ہیں کہ فی الحقیقت ہماری زندگیوں کا اصل سوال ہماری سیرت کا سوال ہے۔ہماری گہری اور پُرمطلب کامیابی یا ناکامی اُن دوسرے درجہ کے سوالوں پر مبنی نہیں جنکے مطابق دنیا ہماری زندگی کا اندازہ لگایا کرتی ہے وہ سیرت پر مبنی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہماری یہ عجیب زندگی صرف سیرت ہی کی تکمیل کے لئے بنائی گئی ہے۔نہ صرف ہمارے باطن میں کیفیات ضمیر ہی اس بات کو ظاہر کرتی ہیں۔بلکہ

واقعات کی دنیا بھی جو ہمارے اردگرد پائی جاتی ہے یہی کہتی ہے
باقی سب اغراض کے ساتھ مثلاً دولت جمع کرنے یا زندگی کا حظ اٹھانے
یا روپیہ کمانے یا عزت اور شہرت پانے کی اغراض کے ساتھ یہ زندگی
پوری پوری مطابقت نہیں رکھتی ہے۔ اشیاء کا گذر جانا۔ قسمت کی
تبدیلیاں۔ مختلف ان دیکھے واقعات جو صحت اور دولت اور خوشی کے
مخالف یا انہیں تباہ کرنے والے ہوتے ہیں صاف صاف ظاہر کرتے ہیں
کہ زندگی ایک چیز ہے جو خاص ان باتوں کیلئے نہیں بنائی گئی ہے انکے حصول کی کوشش
بار بار ناکام رہتی ہے اور وہ اس وقت بھی جبکہ حاصل ہو جاتے ہیں پکے طور پر قبضے
میں نہیں رہتے ہیں یہ دنیا حقیقت میں دنیاداری کی جگہ نہیں ہے۔ مگر غور کیجئے کہ یہ
تمام حالتیں یعنی اشیا کا گذر جانا۔ خطرات کا برپا ہونا بے ثباتی کا پیچھے لگے رہنا۔ ہاں یہ
سب حالتیں وہ حالتیں ہیں جو سیرت کی قدر کرتی ہیں جبکہ وہ سانچے میں ڈھالی جاتی ہے
اُن سے وہ تربیت ہوتی ہے جو آدمی کو ملائم اور روحانی صابر اور بُردبار۔ اور خود انکار
اور پُرمحبت بناتی ہے۔ زندگی کے واقعات اور تمام اغراض کو چکنا چور کر سکتے ہیں پر وہ
اس غرض کو برباد نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ اسکی مدد کرتے ہیں۔ اب اگر یہ بات برحق ہے تو
یقیناً زندگی صحیح طور پر اور اقبالمندی کی صورت میں بغیر اسکے کاٹی نہیں جا سکتی۔ جو
اکیلا ایسا شخص ہے جسنے انسانی حقیقت کے سوال کو پورے اور پُرتاثیر طور پر
حل کیا ہے۔ کیا لازم نہیں ہے کہ ہم اس درجہ تک یعنی کم ازکم اس درجہ تک
کہ جس درجہ تک حقیقت المسیح کا یہ پہلا مطلب ہم پر عیاں ہونا ہے ۔ مسیحی
بننے کی جستجو میں مصروف ہوں ؟

چوتھا باب

حقیقت المسیح کا ایک اور مطلب

حقیقت المسیح کے جس پہلو یا مطلب پر ہم غور کر رہے تھے اُس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ حقیقت المسیح کا پورا پورا مطلب نہیں ہے کیونکہ صاف عیاں ہے کہ اُس سے کئی اور سوالات پیدا ہوتے ہیں۔جو تحقیق طلب ہیں۔پس وہ مطلب گویا پہلا ہی مطلب ہے۔اور ضرور ہے کہ اُس کا بھی کچھ مطلب ہو۔ہم یسوع کی نسبت اتنا کچھ کہہ چکے ہیں کہ کسی اور شخص کی نسبت نہیں کہہ سکتے۔اور چونکہ ہم اس قدر کہہ چکے ہیں اس لئے ضروری امر ہے کہ ہم کچھ اور بھی کہیں۔کیونکہ اگر ہم اِس موقعہ پر ٹھہر جائیں تو ہماری عقل مطمئن نہ ہوگی۔یہ کہنا کہ یسوع نے ایسی سیرت پیش کی ہے جس میں مطلق کوئی داغ نہیں اور جو سراسر نمونہ کے لائق ہے اور نیز یہ کہنا کہ گو اُس کا جسم اس دُنیا میں نظر نہیں آتا تو بھی وہ بنی آدم کے دلوں میں ایک قسم کا شخصی اثر رکھتا ہے جس کے وسیلے سے وہ بھی کچھ درجہ تک اُس نمونہ کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں جس کی تقلید وہ کسی اور طرح نہیں کر سکتے تھے۔اِن باتوں کا دعوے کر کے قلم کو رکھ دینا تسلی بخش طریقہ نہیں ہے۔جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اگر اُس سے کم اخلاقی اور روحانی طور پر اُسکی نسبت کہنا ناممکن ہے تو عقلاً یہ ضروری امر ہے کہ کچھ اور بھی کہا جائے

مطلب یہ ہے کہ حقیقت المسیح کا یہ پہلا مطلب ہمارے سامنے کئی اور نئے سوالات لاتا ہے جنکا جواب دینا لازمی امر ہے ؞

اب جو سوالات اِس سے پیدا ہوتے ہیں وہ ذیل کی قسم کے ہیں کیا تاریخ اور تجربہ کا ایسا واقعہ جیسا کہ ابھی بیان ہوا ہے ہماری زندگی اور نیچر کے فلسفہ کے لئے ایک عجیب اور پُر زور مطلب نہیں رکھتا؟ کیا وہ بھی اور واقعات کے ساتھ اور اُنہی کی طرح حل نہیں کیا جاسکتا؟ کیا تم دُنیا کی تاریکی کے درمیان یہ سمجھکر کہ وہ ایک ایسا واقعہ ہے جو اُس طاقت کی حقیقت پر جو انسان اور اُسکی روح کے اعلےٰ انجاموں کو وجود میں لاتی ہے ایک خاص طرح کی چمکتی ہوئی روشنی ڈالتا ہے قبول نہیں کرسکتے۔ اور کیا ہمیں اُسے قبول نہیں کرنا چاہئے؟ کیا ہم اُس میں کوئی بنیاد ایمان کے لئے نہیں پاتے۔ یعنے کیا ہم خدا کے یقین کی بنیاد اُس میں نہیں پاتے جس کی تلاش میں ہماری روحیں سرگرداں رہتی ہیں مگر اُسے عموماً نہیں پاتی ہیں؟

جب سے یسوع اس دنیا میں آیا تب سے لوگ اِس خیال سے بری نہیں ہوئے کہ ایمان کا مرجع اگر کسی شخص میں ملتا ہے تو غالباً اس ہی میں ملتا ہے۔ اِس بات کی حقیقت پر کسی طرح کا شبہ نہیں ہوسکتا اور نیز یہ بات عجیب طور پر معنی خیز بھی ہے۔ اُس کے پہلے شاگردوں نے ایسا ہی محسوس کیا جبکہ اُن میں سے ایک نے کہا "اَے خداوند ہم کس کے پاس جائیں۔ زندگی کی باتیں تو تیرے پاس ہیں" اور یہی بات اُس کے آخری اور سب سے جدید شاگرد محسوس کرتے ہیں چنانچہ رابرٹ الیمیر کی مصنفہ ۱۸۹۹ء میں اخبار ٹائمز میں اُس دلچسپ اور سرگرم خط کے وسیلے

جس میں سے کچھ اوپر اقتباس ہو چکا ہے) لکھتے ہوئے ظاہر کرتی ہیں کہ جس
گروہ کے ساتھ وہ علاقہ رکھتی ہیں وہ بھی قدیم زمانہ کے پطرس کی طرح (لیکن
بالکل پطرس کے مفہوم کے مطابق نہیں) یہ مانتی ہیں کہ روشنی
اُسی (مسیح) میں ملتی ہے۔ اب آپ اُس گلیل کے مچھوے پر غور کریں۔ جو
صدیاں ہوئیں گذر گیا اور پھر اِس مصنفہ پر جو زمانہ حال میں ملک انگلستان
کے اندر پیدا ہوئی غور کریں اور اِس بات پر بھی نظر ڈالیں کہ اِن دونوں
کے درمیان عقلی معاملات اور دیگر حالات اور خیالات کے اعتبار سے
کیسا بے قیاس فرق پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی دونوں خدا کی تلاش کے
متعلق اُس شخص (مسیح) سے مُنہ نہیں پھیر سکتے۔ نیز اُن بے شمار اور لگاتار
محققوں کے سلسلہ پر نظر ڈالیں جو درمیان کی صدیوں کے اندر اسی بات
کا اقرار کرتے چلے آئے ہیں۔ اور کیا اِس سے بادی النظر ہی میں یہ بات نہیں
کھُل جاتی کہ حقیقت مسیح میں ایک ایسی بات پائی جاتی ہے جو ایمان کے
عظیم سوال کے متعلق ایک عجیب قسم کا مطلب رکھتی ہے ؛

پس ہمارے پاس کافی وجہ موجود ہے اوّل اُس مطلب کی بنا پر جو ہمنے
حقیقت مسیح کے متعلق دریافت کیا اور نیز اُس خیال کی بنا پر جو سرگرم لوگ مسیح
کی حقیقت کے متعلق ہر زمانہ میں رکھتے آئے ہیں۔ ہاں اِن باتوں کی بنا پر ہمارے
پاس کافی وجہ موجود ہے کہ ہم وہ سوالات پوچھیں جنکی طرف اوپر اشارہ
کیا گیا ہے۔ اب جس وقت ہم ایسا کرنے لگیں اُس وقت ہمیں یہ خیال
نہیں کرنا چاہئے کہ ہم مسیحی مذہب کے سادے سے بیان کو چھوڑ کر علم الٰہی
کے دقیق مسائل میں گھس گئے ہیں۔ نہیں ایسا خیال نہیں کرنا چاہئے
کیونکہ جب ہم ایسا کرنے لگتے ہیں تو ہم اُس وقت بھی مسیح ہی کی حقیقت کو

دریافت کرتے ہیں یعنی اُسی تاریخ اور تجربہ کی زندہ حقیقت کی تحقیق کرتے ہیں جسکا نام مسیح ہے۔ اور یہ علم الٰہی کا مسئلہ نہیں ہے۔ پس جب ہم سیرت کے سوالات کو چھوڑکر ایمان کے سوالات کی طرف راجع ہوں تو ضرورت نہیں کہ ہماری تحقیق بوسیدہ صورت اختیار کرے بلکہ چاہئیے کہ اُس وقت بھی زندگی اور تازگی اور تری نمایاں ہو ؛

۱۔ ایمان کی بنیاد

ایمان کی تحقیق کا یہی مقصد نہیں ہے کہ صرف عقلی اور منطقی طور پر یہ بات دریافت کیجائے کہ خدا ہے یا نہیں ہے کہ ایک سبب اوّل ہے یا نہیں جس کا نتیجہ یا اظہار عالم موجودات ہے۔ یہ تحقیق اس سے کہیں بڑھکر ہے۔ یہ تحقیق دراصل ایک شخصی تحقیق ہے اور اُسے آدمی کی ہستی کا صرف عقلی پہلو ہی شروع نہیں کرتا ہے۔ بلکہ انسان کی ساری قوتیں اس بات کی تحقیق میں مصروف ہیں پس انسان فقط ایک قیاسی بات کی تلاش نہیں کرتا بلکہ وہ اُس ہستی کی تلاش کرتا ہے جو اُس کی شخصی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے۔ خواہ یہ تحقیق اپنی مراد کو پہنچے یا نہ پہنچے مگر اس میں شک نہیں کہ یہی بات ہے جس کی تلاش میں انسان کی روح اب ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ وہ رُوح عقلی رُوح کی نسبت زیادہ وسیع اور پیچیدہ اور پُر جذبہ روح ہے۔ وہ رُوح جس طرح ایک عبرانی زبور نویس کے الفاظ سے جو جلاوطن ہوگیا تھا ظاہر ہوتی ہے ویسی سادگی اور سچائی اور تاثیر سے اور کسی جگہ ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ کہتا ہے "میری رُوح خدا کے لئے زندہ

خدا کے لئے ترستی ہے"۔

بعض فلسفانہ مزاج اشخاص اس طرح کی دعا کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ہم کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ہمیں ایک شخصی دوست اور روحوں کے بانی کے اشتیاق وصل کی اِس دلسوزی سے آزاد ہونا چاہیئے اور اپنے فلسفہ میں ثابت قدم رہنا چاہیئے خواہ ہمیں نہایت مغموم ہی ہونا پڑے۔ اور کہ بقا کا خواہشمند ہونا بھی فی الحقیقت ایک طرح کی خود غرضی ہے جس سے دست بردار ہونا بڑی خوبی کی بات ہے۔ زمانہ حال کے فلسفہ اور علم ادب میں بہت درجہ تک یہی تحریک پائی جاتی ہے۔ مثلاً گرتے نے ہمیں یہی صلاح دی ہے اور ہیگل اور جارج ایلیٹ اور میتھو آرنلڈ بھی یہی گیت گاتے ہیں۔ لیکن ہم تو اسے بالکل ایک جھوٹی تسلی" اور بے جان شجاعت سمجھتے ہیں۔ جو اُن باتوں کے ترک کرنے پر فخر کرتی ہے جنہیں کبھی ترک کرنا نہیں چاہیئے" آدمی کو کبھی اُن خواہشوں کو جو وہ ایک شخصیت والے خدا اور شخصی بقا کی نسبت رکھتا ہے کبھی ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انہیں کے اوپر اُسکی ذاتی ہستی اور حقیقی بزرگی منحصر ہے۔ اُسکی اصل ذاتی ہستی اوسکی شخصی ہستی ہے اور وہ اپنی مَیں کے مقابلہ میں ایک تُو کی تلاش میں ہے۔ اور سوائے اُس کے اور کسی بات میں اُس کی سیری اور آسودگی نہیں ہے۔ اِنسان کو اِس سے کم پر اکتفا کرنے کی صلاح دینا گویا اُس کے ساتھ آدمی کی طرح سلوک کرنا نہیں ہے بلکہ یہ فعل روحانی خودکشی کے برابر ہے اور خواہ کیسے ہی فلسفانہ جلال کا لباس کیوں نہ پہنائیں یہ فعل اپنی ذات میں بڑی بے عزتی کا فعل ہے۔ منکر جسے عزت سمجھتے ہیں وہ بے عزتی پر قائم ہے۔ انسان کی حقیقی

بزرگی انہیں شخصی ضرورتوں میں پائی جاتی ہے۔ گوہم بعض اوقات بہ سبب
اپنے عقلی عزور کے اُنکو ایسا مانتے ہوئے شرماتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مذکورہ
بالا دعا جیسی دعائیں پوری نہ ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ ہم باپ کو یعنی ایک
زندہ اور شخصی باپ کو جو ہماری روحوں کا باپ ہے تلاش کریں اور نہ پائیں
یہ ممکن ہے کہ ہم ہمیشہ کی زندگی کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور وہ نہ کھلے۔ پر ڈھونڈنا
اور کھٹکھٹانا وہ باتیں ہیں جنکے وسیلے سے آدمی اپنی چھٹائی کو نہیں بلکہ
اپنی حقیقی بڑائی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ خود غرضی کی کمتری ظاہر نہیں
کرتا ہے بلکہ اُنکے ذریعہ سے اُس لامحدود وسعت کو آشکارا کرتا ہے
جو اُس میں پائی جاتی ہے۔ اور جو وہ آپ ہی ہے۔ وہ ایک نکمی سی
عزت ہے جو انسان اپنے آپ کو اُس وقت دیتا ہے جبکہ وہ محدود فطرت
کے ایک حصہ پر اپنے آپ کو مطمئن رہنے کی صلاح دیتا ہے ۔

اب یہ تلاش جو روحوں کے باپ کے لئے کی جاتی ہے وہ خواہ
حقیقت المسیح میں پوری ہو یا نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نہ فطرت
کے ظاہری اظہاروں سے اور نہ تواریخ کے واقعات اور نہ ان اخلاقی
حقیقتوں سے جو انسان کے دل میں پائی جاتی ہیں پوری ہوتی ہے
ہم ان باتوں کا ذکر مختصر طور پر کرینگے۔ فطرت ہم کو اُن قوتوں کی خبر دیتی
ہے جو صفات شخصیت سے بہرہ ور نہیں ہیں اور نہ وہ حواس رکھتی ہیں
اور جو کچھ انسان پر گذرتی اور بیتتی ہے یعنی اُس کے بیم و رجا کی کچھ پروا
نہیں کرتی ہیں بلکہ بسا اوقات اُسکی مخالفت کرتی ہیں۔ اس میں شک
نہیں کہ فطرت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو فائدہ بخش اور خوبصورت ہے مگر
ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو خونی اور حیوانی ہے۔ ایک تصور ہے جس کے

مطابق وہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کے لئے بھی عجیب قسم کی ہمدردی سے مملو معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اور تصوّر بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ کاموں کے لئے بھی کچھ ہمدردی نہیں رکھتی ہے بلکہ عجیب بیہدردی سے بربادی کے پنجہ میں گرفتار ہونے کے لئے ایک طرف پھینک دیتی ہے فطرت میں ایمان کو اپنا مرجع نہیں ملتا۔ برُے خواب البتہ بہت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ پس فطرت ہماری تحقیق کا جواب نہیں دیتی بلکہ اپنے مشکل اور سختی آمیز گورکھدھندوں سے اُسے ٹھٹھوں میں اُڑاتی ہے۔ وہ صرف یہ کہتی ہے "میں زندگی میں لاتی ہوں۔ میں موت تک پہنچاتی ہوں۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتی"

اب ہم تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی اُس احاطہ کی طرف جس میں نیچر کے احاطہ کی نسبت انسانی طاقت اور عقل زیادہ تر ظاہر ہوئی ہیں کیا اُس میں ہمیں کوئی ایسی اعلیٰ تجویز یا غرض ملتی ہے۔ جو ہمارے ایمان کو مضبوط کرے اور اُسکی ہمت بڑھائے۔ تاریخ! تاریخ تو مایوسی اور رشک سے بھری ہوئی آوازوں کا ایک شور سا ہے۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ "تاریخ کے زمانے ایک بڑھنے اور ترقی کرنے والی غرض رکھتے ہیں" تو بھی ہم اُس میں کہاں ایسی غرض پاسکتے ہیں جو ہمارے لئے کوئی حقیقی مطلب رکھتی ہو؟ ہاں تاریخ ایک بڑا ڈراما تو ہے پر اُس کے ایکٹر اُس کے بانی کو نہیں جانتے اور نہ انکا بانی اُنکو جاننے کی پرواہ کرتا ہے "تمام دنیا ایک سٹیج ہے" اور ہم جو اُس کے غمناک مضحکہ خیز ایکٹر ہیں جبراً اپنے ایکٹ کا حصہ پورا کرتے ہیں اور پھر اس سٹیج پر سے گذر جاتے ہیں۔ اب تھوڑی دیر کے لئے ہم نیچر اور تاریخ سے مُنہ پھیر کر اُس دُنیا

بزرگی انہیں شخصی ضرورتوں میں پائی جاتی ہے۔ گو ہم بعض اوقات بہ سبب
اپنے عقلی غرور کے اُنکو ایسا مانتے ہوئے شرماتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مذکورہ
بالا دعا جیسی دعائیں پوری نہ ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ ہم باپ کو یعنی ایک
زندہ اور شخصی باپ کو جو ہماری روحوں کا باپ ہے تلاش کریں اور نہ پائیں
یہ ممکن ہے کہ ہم ہمیشہ کی زندگی کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور وہ نہ کھلے۔ پر ڈھونڈنا
اور کھٹکھٹانا وہ باتیں ہیں جنکے وسیلے سے آدمی اپنی چھٹائی کو نہیں بلکہ
اپنی حقیقی بڑائی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ خود غرضی کی کہتری ظاہر نہیں
کرتا ہے بلکہ اُنکے ذریعہ سے اُس لامحدود وسعت کو آشکارا کرتا ہے
جو اُس میں پائی جاتی ہے۔ اور جو وہ آپ ہی ہے۔ وہ ایک نکمّی سی
عزت ہے جو انسان اپنے آپ کو اُس وقت دیتا ہے جبکہ وہ محدود فطرت
کے ایک حصّہ پر اپنے آپ کو مطمئن رہنے کی صلاح دیتا ہے ؛

اب یہ تلاش جو روحوں کے باپ کے لئے کی جاتی ہے وہ خواہ
حقیقت المسیح میں پوری ہو یا نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نہ فطرت
کے ظاہری اظہاروں سے اور نہ تواریخ کے واقعات اور نہ اُن اخلاقی
حقیقتوں سے جو انسان کے دل میں پائی جاتی ہیں پوری ہوتی ہے
ہم اِن باتوں کا ذکر مختصر طور پر کرینگے۔ فطرت ہم کو اُن قوتوں کی خبر دیتی
ہے جو صفات شخصیت سے بہرہ ور نہیں ہیں اور نہ وہ حواس رکھتی ہیں
اور جو کچھ انسان پر گذرتی اور بیتتی ہے یعنی اُس کے بیم و رجا کی کچھ پروا
نہیں کرتی ہیں بلکہ بسا اوقات اُسکی مخالفت کرتی ہیں۔ اس میں شک
نہیں کہ فطرت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو فائدہ بخش اور خوبصورت ہے مگر
ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو خونی اور حیوانی ہے۔ ایک تصور ہے جس کے

مطابق وہ چھوٹی سی چھوٹی چیز کے لئے بھی عجیب قسم کی ہمدردی سے مملو معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اور تصوّر بھی ہے جس کے مطابق وہ اپنے اعلےٰ سے اعلےٰ کاموں کے لئے بھی کچھ ہمدردی نہیں رکھتی ہے بلکہ عجیب بیہمدردی سے بربادی کے پنجہ میں گرفتار ہونے کے لئے ایک طرف پھینک دیتی ہے فطرت میں ایمان کو اپنا مرجع نہیں ملتا۔ بُرے خواب البتہ بہت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ پس فطرت ہماری تحقیق کا جواب نہیں دیتی بلکہ اپنے مشکل اور سختی آمیز گورکھ دھندوں سے اُسے ٹھٹھوں میں اُڑاتی ہے۔ وہ صرف یہ کہتی ہے "میں زندگی میں لاتی ہوں۔ میں موت تک پہنچاتی ہوں۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتی"

اب ہم تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی اُس احاطہ کی طرف جس میں نیچر کے احاطہ کی نسبت انسانی طاقت اور عقل زیادہ تر ظاہر ہوئی ہیں کیا اُس میں ہمیں کوئی ایسی اعلےٰ تجویز یا غرض ملتی ہے ۔ جو ہمارے ایمان کو مضبوط کرے اور اُسکی ہمت بڑھائے ۔ تاریخ؟ تاریخ تو مایوسی اور رشک سے بھری ہوئی آوازوں کا ایک شور سا ہے۔ اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ "تاریخ کے زمانے ایک "بڑھنے اور ترقی کرنے والی غرض رکھتے ہیں" تو بھی ہم اُس میں کہاں ایسی غرض پاسکتے ہیں جو ہمارے لئے کوئی حقیقی مطلب رکھتی ہو؟ ہاں تاریخ ایک بڑا ڈراما تو ہے پر اُس کے ایکٹر اُس کے بانی کو نہیں جانتے اور نہ انکا بانی اُنکو جاننے کی پرواہ کرتا ہے "تمام دنیا ایک سٹیج ہے" اور ہم جو اُس کے غمناک مضحکہ خیز ایکٹر ہیں جبراً اپنے ایکٹ کا حصہ پورا کرتے ہیں اور پھر اس سٹیج پر سے گذر جاتے ہیں۔ اب تھوڑی دیر کے لئے ہم نیچر اور تاریخ سے مُنہ پھیر کر اُس دُنیا

کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہمارے اندر پائی جاتی ہے - اور اس امید سے کہ یہاں ضمیر کی دنیا میں ضرور کوئی نہ کوئی خاص شہادت "اُس زندہ خدا" کی نسبت ملیگی جو ہمارا خدا ہو ؟ لیکن یہاں بھی مشکل سے ایسی شہادت ملتی ہے - ضمیر کا قانون جو ہمارے اندر موجود ہے واقعی ایک عجیب قسم کا حکم اور زور ہے اور وہ جب جب اپنے آپ کو حیطۂ احساس میں لاتا ہے اسی وقت ایک شریعت دینے والے یعنی ایک اخلاقی شخص کے وجود پر دلالت کرتا ہے - مگر فی ذاتہ وہ ہمیں پکے اور یقینی طور پر انسانی زندگی کی ایک حقیقت اور اُصول کے پرے نہیں لیجاتا - اور وہ حقیقت اور اُصول یہ ہے کہ جسے ہم اخلاق کہتے ہیں وہ ہمارے لئے ایک طرح کی نیکی اور آسودگی اور قوت ہے اور وہ جو اُس کے برعکس ہے وہ بدی ہے - اور وہ بے چینی اور کمزوری کا منبع ہے - جیسا ہم نے کہا کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس سے دلالتٗ اور کچھ بھی مترشح ہوتا ہے - مگر صاف صاف طور پر یہ اصول اور کچھ نہیں کہتا - یہ تبدیل الفاظ ہم یہ کہیں کہ اگر کچھ کہتا ہے تو ایسی صورت میں کہتا ہے کہ اپنے آپ کو مضبوط ایمان کی بنیاد نہیں ٹھہراتا ہے ؛

پس نہ فطرت میں اور نہ تاریخ میں اور نہ ضمیر میں ایمان اُس چیز یا شخص کو جس کی طرف وہ راجع ہے پاتا ہے - یاد رکھنا چاہئے کہ ہم نے یہ نہیں کہا ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایمان کی آرزو یا امیدوں کو باطل ٹھہراتی ہیں - یہ دعوٰے کسی طرح صحیح نہیں ہے - پر جو ہم کہتے ہیں سو یہ ہے کہ یہ باتیں ایمان کی خواہش اور امید کو آپ ہی آپ پورا نہیں کرتی ہیں - اور دانا سے دانا آدمی بھی اس بات پر اتفاق کرتے ہیں - ہمارے خیال

میں جو لوگ اِس بات سے واقف ہیں اُنکے رہنماؤں میں سے وہ جنکے
خیالات کو اِن معاملات کے متعلق زیادہ اونچی جگہ دینی چاہئے یہ ہیں۔
افلاطون متقدمین کے درمیان۔ ڈنٹی متوسطین کے درمیان۔ اور بیکن
متاخرین کے درمیان۔ شیکسپیر چونکہ اِن سوالوں پر بحث نہیں کرتا لہذا
اُس کا نام اِن میں درج نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بات میں یہ تینوں شخص
زیادہ صفائی کے ساتھ ایسے متفق نہیں ہیں جیسے کہ اِس بات میں ہیں
کہ ایمان کی خواہش کو فقط نیچر اور انسانی زندگی سے مطمئن کرنے کی جو عقلی
کوشش کیجاتی ہے اس سے بڑھکر اور کوئی کوشش بے پھل نہیں ہے یا
کم از کم یہ کہیں کہ اُس سے بڑھکر اور کوئی کوشش کمزور نہیں ہے۔ مثلاً
بیکن کہتا ہے "میری سمجھ میں یہ بات محفوظ نہیں ہے" اور افلاطون کی ایک
کتاب میں ایک نہایت رقت انگیز مقام پایا جاتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا
ہے کہ ہمارا تاریکی اور شک کے سمندروں میں سے عقل کی "لکڑی" پر سوار
ہو کر عبور کرنے کی اُمید رکھنا "بغیر خطرے کے نہیں ہے" اور پھر اسپر یہ اضافہ
کرتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اگر آدمی کے پاس خدا کا کلام نہ ہو جو یقیناً حفاظت
کے ساتھ اُسے پار اُتارے تو خطرہ ضرور لاحق ہو گا ؛

اب افلاطون کا یہ کلام نہ صرف رقت انگیز ہے بلکہ ہمارے لئے
معنی خیز بھی ہے یعنی یہ الفاظ کہ "خدا کا کوئی کلام نہ ہو جو اُسے یقیناً حفاظت
کے ساتھ پار اُتارے گا معنی خیز ہیں۔ اور ہم اِس خیال کے ساتھ انجیل
نویس کے اِن کلمات کو مربوط کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں "کلام مجسم ہوا
اور ہمارے درمیان رہا۔" اب کیا حقیقتِ مسیح میں ہم خدا کا ایسا کلام پاتے
ہیں جس کی مانند ایمان کی تحقیق کو دوسری جگہ کوئی کلام نہیں مل سکتا رسول کی

یہ صدا کہ "اے خداوند ہم کس کے پاس جائیں" ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ پر کیا ہم اُس کے ساتھ متفق ہو کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں، ہمیشہ کی زندگی کی باتیں تو تیرے ہی پاس ہیں ؟

ہمیں اِس سوال کے جواب پانے کا حوصلہ نہ صرف رسول کی گواہی سے ملتا ہے جو اکیلی شاید ہمارے لئے بہت وزن دار نہ ہوتی۔ پر ہم دیکھتے ہیں کہ مسیح نے خود کئی بار کہا کہ روح کی تلاش جو وہ دربارۂ خدا کرتی ہے مجھ میں پوری ہوتی ہے۔ ہم اِس قسم کے مقام کی طرف جیسا کہ یہ ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اُسنے باپ کو دیکھا" اشارہ نہیں کرینگے کیونکہ ممکن ہے کہ اسپر تفسیری یا تنقیدی مباحثہ برپا ہو جائے۔ ہم کم از کم ایک مقام پہلی تین انجیلوں میں پاتے ہیں جو ہمارے مطلب کو پورا کرتا ہے اور وہ پالش لنخ کی نظر میں اصلی ہے یعنی لاگیا (کلمات) کے اصلی مجموعہ میں پایا جاتا ہے جب یسوع نے یہ کہا کہ میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے اور کہ "کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اُس کے جسپر بیٹا اُسے ظاہر کرنا چاہے (متی ۱۱: ۲۷ و لوقا ۱۰: ۲۲) تو اُس نے گویا تین باتوں کا دعوٰے کیا اوّل اُس نے یہ دعوٰے کیا کہ ایمان کا مرجع خدائے زندہ اور محبت کرنیوالا خدا ہے۔ دوم اُس نے یہ ظاہر کیا جیسا کہ افلاطون اور دُنٹی اور بکن نے بھی ظاہر کیا کہ آدمی اپنی ذاتی دانائی سے اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔ سوم اُس نے اس بات کا دعوٰے کیا کہ میں نے خود اس تلاش کے تقاضے کو پورا کیا ہے اور دوسرے لوگ بھی اِس تلاش کے مرجع کو مجھ میں اور مجھی اکیلے میں پاتے ہیں۔ وہ جو دُنیا میں مذہب کا سب سے بڑا اُستاد تھا وہ اوّل تو اِس

بات کو خوب جانتا تھا کہ ایمان کی تلاش اور تحقیق میں انسان کیا جگہ رکھتا ہے
اور دوم یہ بھی جانتا تھا کہ وہ تلاش صرف مجھ ہی میں اپنی مراد کو پہنچتی ہے
یہاں افلاطون کی طرح کسی مضبوط کلام کا انتظار نہیں پایا جاتا بلکہ ہم کو
سچائی کا یقین دلایا جاتا ہے۔ اور ہم نے یقیناً یسوع کی نسبت ابتک
بہت کچھ دیکھ لیا ہے جو ہمیں اِس بات کے لئے تیار کرتا ہے کہ جب
وہ اِس طرح کلام کرے تو ہم توجہ سے اُس کی بات کو سُنیں ؛

جب ہم اُس بات پر غور کرتے ہیں جو حقیقت مسیح میں موجود ہے
اور ایمان کے لئے یقین کے معنے رکھتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ
جو اصل بات اُس میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ فوق العادت ہے
ہم اِس لفظ کو بغیر کسی طرح کے تعصب کے استعمال کرتے ہیں اور عین
اِس کے لفظی معنوں کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اور ہمارا مطلب
اِس لفظ کے استعمال سے یہ ہے کہ یسوع صرف اُن ہی طاقتوں کا مجموعہ
نہیں ہے جن طاقتوں سے انسانی ذات جیسی کہ وہ ہمیں معلوم ہے
بنی ہوئی ہے۔ عقلی طور پر اِس بات کا اِنکار کسی طرح ہو نہیں سکتا
ہم یہاں پر اُن باتوں کا جنہیں معجزات کہا کرتے ہیں تذکرہ چھیڑنا نہیں
چاہتے۔ گو اس کا یہ سبب نہیں ہے کہ ہم اس مضمون کو ہاتھ لگانے سے
ڈرتے ہیں کیونکہ یسوع مسیح کے مردوں میں سے جی اُٹھنے پر جو تواریخی
گواہی ہمارے سامنے آتی ہے وہ واقعی لاجواب ہے پس اگر معجزات
کے سوال کو ہاتھ نہیں لگاتے تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس سوال
کو کمزور سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ ایسا سوال ہے کہ اس میں خدا اور
نیچر کے متعلق کئی باتیں پہلے ہی سے فرض کرنی پڑتی ہیں مگر اِن باتوں پر

بحث کرنا ہمیں ہمارے مضمون زیر نظر سے بہت دور لیجائیگا۔ یہ اگر بفرض محال اُس کے معجزانہ کاموں پر اعتراض بھی کیا جائے تو تو بھی کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ اُس کی خصلت اُس کے معجزوں سے بھی زیادہ زور سے اِس بات پر گواہی دیتی ہے کہ وہ ایک فوق العادت شخص تھا۔ اسکی خصلت یا سیرت بقول ٹینی سن "سب سے بڑے معجزے سے بھی زیادہ عجیب واقعہ تھی" اور اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ایک ہی بات کافی ہے اور وہ اُسکی بیگناہی ہے۔ اور اِس بات کے یقین کی دلیل کہ اُسکی بیگناہی ایک تواریخی واقعہ ہے نہ کہ قیاس کا ڈھکوسلا ہم اوپر پا چکے ہیں۔ اس بات پر کئی ایسے لوگ صاد لکھتے ہیں جنپر یہ شک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی ایسے تعلیمی میلان میں مبتلا تھے جس نے اُنکی رائے کو اپنے رنگ سے رنگین کیا۔ پروفیسر آرجو بڑے ذوق وشوق سے اہل جرمن کی رائے پیش کیا کرتے ہیں اُن لوگوں کے شمار میں جو اس بات کو قبول کرتے ہیں ذیل کے اشخاص کو درج کرتے ہیں۔ ہیگل کے پیروؤں کے درمیان ڈرب اور مار ہائینیکے۔ روزن کرنز اور وائکے جیسے اشخاص کو اور عالمانِ علم الہیہ کے زمرہ میں شلائر میخر بالش کنخ اور روئے اور رچل جیسے عالموں کو اور وسیع خیال نصیولوجوں کے درمیان ہازا اور شنکل جیسے لوگوں کو شامل کرتے ہیں بلکہ اِس زمرہ میں سٹیس اُس جیسے شخص کو بھی داخل کرتے ہیں جو معجزانہ اظہاروں کا سخت مخالف تھا۔ یہ سب اشخاص مسیح کی بیگناہی کے قائل تھے۔ ایسے اشخاص کی اسناد کی فہرستوں کو بڑھانا رُوح کو اِتنی روشنی نہیں بخشتا۔ جتنا جسم کو تھکاتا ہے تاہم یہ نام اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے جبکہ کوئی شخص اِس بات کو محسوس کر لیتا ہے کہ جس بات پر یہ سب علما متفق ہیں وہ کیا

ہے کیونکہ خواہ ہم اِس بات پر کیسا ہی پردہ کیوں نہ ڈالیں ہم اِس بات پر شک نہیں لا سکتے کہ بیگناہی ایک امرِ فوق العادت ہے۔ گناہ جیسا ہم جانتے ہیں انسانی طبیعت میں ضرور پایا جاتا ہے پس جس شخص میں گناہ نہیں ہے وہ شخص اگر انسان سے نچلے طبقہ یعنی حیوانوں کے طبقہ سے علاقہ نہیں رکھتا تو وہ ضرور ایک فوق العادۃ ہستی ہے پر اگر اس بیگناہی پر بھی بحث کیجائے تو تو بھی یہ بات کہ یسوع ایک فوق العادت شخص ہے اس آدمی کو ماننی پڑیگی جس کے لئے یسوع مسیح کی زندہ رُوح زندگی اور سیرت میں ایسی طاقت ثابت ہوتی ہے جیسی کہ اوپر بیان ہوئی۔ جو شخص اِس قوت کا شخصی تجربہ رکھتا ہے اُسے نہ یسوع کے دعووں کے پڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ جرمن نکتہ چینیوں کی رعایت کی۔ کیونکہ وہ اس بات کی گواہی اپنے ہی اندر پاتا ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ نئی زندگی کا اصول اور اُس کی طاقت یعنی اُس نئی زندگی کا اصول اور طاقت ہے جو اُس کی تمام ذاتی طاقتوں سے زیادہ زور آور ہے تو وہ فوراً اور بے ہچکچاہٹ یوں استدلال کرتا ہے "اگر یہ آدمی خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو کچھ نہ کرسکتا" گو ہم ابھی پورے طور پر یہ نہیں بتا سکتے کہ الفاظ "خدا کی طرف سے" کیا معنی رکھتے ہیں۔ تاہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کم از کم اِن سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ یسوع میں ایک ایسی طاقت عیاں ہوئی جو انسانی زندگی کی ذاتی طاقتوں سے بزرگتر ہے یہی ایک عجیب حقیقت ہے اور اسے فوق العادت کہنا بیجا نہیں ہے یہاں ایک حقیقت ہے جو تحقیق ایمان کے لئے ایک عجیب اور بے نظیر مطلب رکھتی ہے۔ یہ حقیقت اُن ساری باتوں سے جو اُس سوال سے

علاقہ رکھتی ہیں جسکا جواب ہم ڈھونڈ رہے ہیں ہمیں بہت زیادہ تحقیق الایمان کے بارے میں بتاتی ہے ۔ ہم نیچر کے جواب پر غور کر چکے ہیں مگر یہاں ایک فوق العادت حقیقت ہے جسپر غور کرنا ابھی باقی ہے ؛ اب ہم اُس منزل تک پہنچ گئے ہیں جہاں دُنیا کی اُن حقیقتوں کے درمیان جو ایمان کی تلاش کے سوال کا کافی جواب نہیں دیتی ہیں ۔ ہمارے سامنے حقیقت المسیح نمودار ہوتی ہے جو ایک بے نظیر مطلب رکھتی ہے کیونکہ تاریخ کی دیگر حقیقتوں کی طرح نہیں ہے بلکہ اُس سے بہت بلند و بالا ہے وہ بجائے خود ایک حقیقت ہے اور دنیا کی اور حقیقتوں سے افضل ہے ۔ پس اس حقیقت کا مطلب ایک ایسا کامل پیغام ہے جسے کم درجہ حقیقتوں کا ظاہرا مطلب نہ تبدیل کرتا ہے اور نہ منسوخ ۔ اور سب حقیقتیں حقیقت المسیح سے نیچے ہیں کیونکہ اُس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ گناہ اور موت کی سی عظیم حقیقتوں سے بھی بالاتر ہے ۔ پس انسان کی روح ایمان کے مرجع کی تلاش میں اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتی ہے تاکہ اُسے تسلی بخش جواب حاصل ہو ۔ اور وہ یہ پوچھتی ہے کہ وہ طاقت جو مسیح کی عالیشان حقیقت میں موجود ہے کس طرح کی طاقت ہے ؟

پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ یہ طاقت لاریب روحانی طاقت ہے ہاں یہ حیوانی اور مہمل قسم کی جسمانی زبردستی نہیں ہے ہم جو باعقل مخلوق ہیں اس قسم کی طاقت سے کہیں افضل ہیں ۔ اگر ہمیں جبراً اِس قسم کی زبردستی کی پابندی کرنی پڑتی تو اُس حالت میں بھی ہم اُس سے افضل ہوتے ۔ پس وہ طاقت ایک روح ہے وہ ہماری

روحوں سے بڑھکر ہے - اور اُس کی زبردستی ہمیشہ عقل کے وسیلے کام کرتی ہے - اس کی تابعداری ہماری آزادی ہے - دوم یہ طاقت - جو مسیح میں پائی جاتی ہے اخلاقی ہے - گویا یہ پاکیزگی اور سچائی اور محبت کی طاقت ہے - اور یہ ہمارے دلوں میں کام کرتی ہے - جو کچھ ہم اِن صفتوں کی نسبت جانتے ہیں اِسی طاقت کے وسیلے سے جانتے ہیں - سوم یہ طاقت شخصی ہے - اِس دعوے سے ہمارا اس وقت یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ طاقت خود ایک شخص ہے - گو یہ بات بالکل صحیح ہے کیونکہ وہ طاقت جو رُوح ہے وہ خود شخص بھی ہے پر اس وقت بیشتر ہماری یہ مراد ہے کہ یہ طاقت ہمیں شخصیت والی ہستیاں سمجھتی ہے - وہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتی جیساکہ لوگ محض خاک کے تودے کے ساتھ کیا کرتے ہیں - وہ ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ جدا جدا پیش آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم میں سے ایک ایک کے لئے ہے - نیچر کے قوانین اور تاریخ کے واقعات سے عام مطالب صادر ہوتے ہیں - اور اُن سے ہمیں اپنے لئے جداگانہ طور پر مشکل سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے - لیکن حقیقت المسیح پر غور کرتے ہوئے اس کے برعکس یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہم اُسے عام طور پر ظاہر نہیں کر سکتے حالانکہ ہمیں اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ ہماری روحوں کے لئے اس کا کیا مطلب ہے ؛

پس ہم اُس طاقت کی نسبت جو مسیح کی حقیقت میں پائی جاتی ہے یہ کہتے ہیں کہ وہ روحانی اور اخلاقی اور شخصی طاقت ہے - اب کیا یہی طاقت جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہیں وہ خدا نہیں ہے جسکی تلاش

میں ہماری روحیں سرگرداں ہیں اگویی طاقت وہ طاقت نہیں ہے جسکا ابھی بیان ہوا تو اور کیا ہے؟ ہاں وہ ایک ایسا خدا ہے جو فقط نیچر کی کل کا ایک حصہ نہیں ہے بلکہ اُس کا مرتب کرنیوالا ہے وہ روح ہے جس طرح کہ ہم جو روحوں کے باپ کی تلاش میں مصروف ہیں روحیں ہیں۔ وہ اخلاقاً پاک ہے۔کیونکہ ہم اُسے جو نیک نہیں ہے خدا نہیں کہہ سکتے۔آخر میں ہم یہ کہینگے کہ وہ وہ خدا ہے جو ہمیں علم اور ارادہ رکھنے والی ہستیاں سمجھ کر ہم سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسا کہ ایسے مخلوقوں سے کرنا چاہیئے۔ وہ نیچر کی طرح ہمسے پیش نہیں آتا۔نیچر تو ہم سے ایسا سلوک کرتی ہے کہ گویا ہم اُس کے دائمی پروگرام پر گھاس پھوس سے بڑھکر نہیں ہیں۔پس وہ طاقت جو یسوع مسیح میں پائی جاتی ہے یقینی اور حقیقی طور پر اس اعتقاد کا شروع ہے کہ ایک زندہ خدا موجود ہے جو ہماری روحوں کا دوست اور باپ ہے۔اور وہ تلاش جو اُس کے ملنے کے لئے کیجاتی ہے حقیقت المسیح کے "یقینی کلام" میں پوری ہوتی ہے ؛

پس حقیقت المسیح اُس ایمان کی بنیاد ہے جو ہم زندہ خدا پر رکھتے ہیں۔یاد رہے کہ یسوع کی تعلیم یہ بنیاد نہیں ہے۔جو کچھ یسوع خود ہے اور جو مطلب اُس کی ذات سے صادر ہوتا ہے وہ ایمان کی بنیاد ہے یہ امتیاز نہایت ضروری ہے کیونکہ ایمان اعلےٰ درجہ کے اُستادوں کے تصورات پر مبنی نہیں وہ اُس حقیقت پر قائم ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یسوع خدا کا کلام ہے۔پس بنیاد یہ دعوےٰ نہیں ہے کہ یسوع نے کلام کیا اور اُس کا کلام اناجیل میں قلمبند ہے۔بنیاد یہ ہے

کہ خدا نے کلام کیا اور کہ اُس کا کلام تاریخ اور تجربہ میں موجود ہے۔ اس امتیاز کا فائدہ یہ ہے کہ ہمیں اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایمان جس چیز کا طلبگار ہے وہ نئے تصورات نہیں ہیں بلکہ نئی حقیقتیں ہیں۔ کیونکہ بہ حیثیت تصورات مسیحی مذہب کے بعض بعض بڑے مسائل بھی مثلاً خدا کی الوہیت پر بھروسہ رکھنا اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے کی امید کرنا بالکل نئے تصورات تو نہیں ہیں۔ کئی سرگرم اور بزرگ لوگوں کی عقل ان باتوں تک پہنچ چکی ہے۔ اگر ایسا ہو چکا تھا تو پھر ایمان کے لئے کس بات کی کمی تھی؟ اس بات کی کمی تھی کہ سوائے تصورات۔ قیاسات اور خواہشات کے اُس کیلئے اور کچھ نہ تھا۔ مگر ان باتوں کے متعلق ہمارے خیالات اصل حقیقت کا صحیح پیمانہ نہیں ہو سکتے۔ زندگی کی سخت اور اٹل حقیقتوں کے سامنے اور خصوصاً زندگی کی آخری حقیقت یعنی موت کے سامنے یہ خیالات کیسی آسانی سے کافور ہو جاتے ہیں۔ ایک انگریز شاعر نے خوب کہا ہے کہ آدمی کی امیدیں "اُس دھوئیں کے ستون کی طرح ہیں جو بڑے کروفر کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھتا ہے مگر رقیق ہوا میں پہنچکر پھیل جاتا اور پراگندہ ہو جاتا ہے اور پھر دکھائی نہیں دیتا"۔ پس اس "رقیق ہوا" یعنی موت کے دم کے سامنے ہمیں کون یہ یقین دلائیگا کہ یہ امیدیں اور قیاس آدمی کے واہمہ کی آگ کے "دھوئیں کا ستون" نہیں ہیں بلکہ اُس "بادل کا ستون" ہیں جو ہمیں ملک موعود کی طرف لئے جاتا ہے۔ جو ایمان اس قسم کے قیاسوں پر مبنی ہوتا ہے۔ اُسے بعض خاص قسم کی طبیعتوں کے آدمی تو البتہ ہمیشہ پسند کرینگے۔ پر یہ یاد رہے کہ یہ پسند زیادہ تر طبعیت ہی کی خصوصیت پر منحصر ہوگی۔ پر اس طرح کا اعتقاد عام لوگوں پر گرفت پیدا نہیں کریگا اور اس کی یہی وجہ ہے

کہ یہ اعتقاد تصورات کی ایک ایسی عمارت ہے جو حقیقت کے چٹان پر تو قائم ہے پر کمزور صورت میں قائم ہے۔ مگر مسیحی مذہب اس حقیقت پر مبنی ہے ہم پھر کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد مسیح کے تصورات نہیں ہیں بلکہ اسکی حقیقت ہے۔ مسیحی مذہب کوئی نئی تعلیم پیش نہیں کرتا بلکہ ایک نئی حقیقت پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے پاس اس قیاس کے ساتھ نہیں آتا کہ ایک خدا ہے جو باپ کی سی خاصیت رکھتا ہے۔ بلکہ وہ ہمارے پاس تاریخ اور تجربہ کے ایک اظہار یا واقعہ کے ساتھ آتا ہے جو ہمپر خدا باپ کو ظاہر کرتا ہے اب یہ سب باتیں ایسی ہیں جنہیں ایمان طلب کرتا ہے۔ ایمان بھی مثل ہر صداقت کے اُس شخص کی طرح ہے جسکا ذکر ایک یونانی کہانی میں پایا جاتا ہے۔ اُس کا نام انٹی اس تھا اور جب وہ مادر زمین کو چھوتا تھا تو کوئی اُسے مغلوب نہیں کرسکتا تھا۔ ایمان کی زمین حقیقت ہے یعنی مسیح کی حقیقت ۔

اِس وقت جبکہ ہم ایمان کو حقیقت المسیح پر قائم کر رہے ہیں لازم ہے کہ ہم جیسا اوپر دیکھ چکے ہیں ایک مرتبہ پھر اُسی بات کو یاد کریں۔ یعنی اس بات کو کہ حقیقت المسیح دوہری حقیقت ہے۔ یعنی خارجی تاریخ اور باطنی تجربہ کی حقیقت ہے۔ اسی دُہری حقیقت پر ہمارا ایمان مبنی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ ایمان جس طرح روحانی گواہی پر قائم ہے اُسی طرح تاریخی گواہی پر بھی قائم ہے۔ ہمارے زمانہ میں یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ روحانی گواہی پر تو زور دیتے ہیں مگر تاریخی گواہی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً ٹی۔ ایچ۔ گرین اور ڈاکٹر مارٹی نو جیسے بزرگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان کی بُنیاد صرف اُس مذہبی احساس پر قائم کیجائے جو

باطن میں موجود ہے اور کہ اُس کا انحصار کسی خارجی تواریخی مکاشفہ پر نہ ہو اب یہ بات برحق ہے کہ کوئی خارجی اختیار ایمان کو قائم نہیں کرسکتا۔ یہ بات پہلے صاحب جیسے مصنفوں کے زمانہ میں کسی قدر نظر انداز ہوگئی تھی۔ پر ہم مانتے ہیں کہ یہ سچ ہے کہ ہم باطن ہی میں قائل کئے جاتے ہیں اور کہ یہ بات خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ باطنی تجربہ کو ہم بالکل علیحدہ کرلیں اور اُس کے ماننے وقت دوسری بات کو یعنی تاریخی حقیقت کو بالکل رد کردیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب باطنی تجربہ اس طرح علیحدہ کرلیا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ہمیشہ قائم نہیں رکھ سکتا ہے۔ فی الحقیقت باطنی تجربہ کوئی پکا اور محکم گواہ نہیں ہے لیکن مسیحی مذہب کا دعوےٰ یہ ہے کہ خدا نے انسان سے دو صورتوں میں کلام کیا ہے اور اُن میں سے ایک صورت دوسری صورت کی تائید کرتی ہے یعنی تواریخی مسیح کی گواہی باطنی گواہی کی تائید کرتی اور یوں اُس کا یقین ہمیں دلاتی ہے (نہ کہ جیسا گرین صاحب بیان کرتے ہیں کہ وہ فضول ہے) "مسیح کا طریقہ یقیناً" یہی تھا۔ کینن گور صاحب اس کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "وہ (یسوع) یہی چاہتا تھا کہ مذہب دُہری بنیاد پر قائم ہو"۔ پس اس تاریخی تائید کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن اِس لئے نہیں کہ وہ ایمان کو پیدا کرے کیونکہ وہ ایمان کو پیدا نہیں کرسکتی۔ پر اس لئے کہ وہ ایمان کو ہمارے اندر مضبوط کرے اور ہمیں یقین دلائے کہ ہم غلطی میں مبتلا نہیں ہیں۔ پس مسیح کی نسبت اندرونی اور بیرونی گواہیاں آپس میں جُٹی ہوئی ہیں۔ تاریخی گواہی روحانی گواہی پر مہر کرتی ہے اور روحانی تاریخی پر صاد لکھتی ہے۔ ہاں ایمان مسیح کی کامل حقیقت پر قائم ہے۔ جو تاریخ میں بھی

بھی اور تجربہ میں بھی زندہ خدا پر اشارہ کرتی ہے ؛

یہاں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم ایمان کے مختلف اجزاء پر غور کریں - کیونکہ یہ اظہر ہے کہ اگر یسوع انسان کے لیئے خدا کا کلام ہے تو اُس میں سب کچھ شامل ہے - اگر خدا نے ہمارے ساتھ کلام کیا ہے - جیسا ہم عرض کر چکے ہیں تو یہ ہمارے لیئے کافی ہے - بے شک اِس سے ساری باتیں تو ظاہر نہیں ہوتی ہیں لیکن ایک بات جس کا جاننا ہمارے لیئے اشد ضروری ہے وہ اِس سے ضرور ظاہر ہوتی ہے - یعنی خدا کی سیرت خدا وہ خدا ہے جس نے یسوع کو بھیجا - اگر یہ بنیادی اُصول مانا جائے - تو ایمان ہر بات کو آپ ہی آپ حل کریگا - بطور نظیر آپ بقا پر غور کریں - مسیحی ایمان کے پاس کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ موت سب چیزوں کا خاتمہ نہیں ہے - لیکن جب خدا کی سیرت کا یقین ہو جاتا ہے تو ایمان کو یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جو قبر کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے ہمیں جب یہ ایمان حاصل ہو جاتا ہے تو ایماندار آدمی اپنے عزیزوں کو بڑی امید کے ساتھ اُس کے حوالے کر دیتا ہے - ایمان کا یہ عمل اُس سپر چوال ازم سے جو قفل توڑنے کی کوشش کرتا ہے کیسا ہزارہا درجہ بہتر ہے ایمان کے تمام سوالوں میں خدا کی سیرت کا سوال مقدم ہے - اور جب اُس کا جواب مل جاتا ہے تو ایمان ہر بات کی نسبت مطمئن خاطر ہو جاتا ہے ؛

کیا ہم اس وقت قلم رکھ دیں اور یہ کہیں کہ گو ہم نے تھوڑا سا بیان کیا ہے تاہم اتنا کر دیا ہے کہ مسیح کی حقیقت بہ متعلق ایمان کے روشن ہو گئی ہے؟ نہیں - ایسا کہنا ناممکن ہے - کیونکہ ہمنے جو کچھ اوپر لکھا ہے اُسے رقم کر کے اور کئی سوال برپا کر لیئے ہیں جو ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم اور بھی تحریر کریں -

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ یسوع کا پورا پورا بیان اس بنا پر نہیں ہو سکتا کہ وہ صرف زمینی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ کسی عجیب معنی میں "خدا کی طرف" سے تھا۔ وہ آدمی سے جیسا کہ ہم آدمی کو جانتے ہیں بڑھکر تھا۔ اب اس بات پر سے پردے کو اُٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ کسی نہ کسی وقت ہمیں یہ کہنا پڑیگا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے باوجود اُسکے ہمیں ابھی صاف صاف طور پر اور پختگی کے ساتھ یہ بتانا چاہیئے کہ مسیح کی حقیقت جو اس مطالعہ میں رفتہ رفتہ گہری ہوتی گئی ہے۔ در اصل کیا ہے ؛

۲۔ اور کلام خدا تھا

جو سوال اس وقت زیر نظر ہے وہ ایک پہاڑ کی طرح سر بلند ہے جو وادی سے نظر آتا ہے۔ وہ اِسقدر ہم سے اونچا ہے کہ دیکھتے ہوئے عقل چکر میں آجاتی ہے۔ مگر پہلی ہی نظر میں چوٹی دکھائی دینے لگجاتی ہے۔ یعنی جو سوال درپیش ہے یہ ہے۔ کہ اگر یسوع خود اپنی نظر میں اور نیز اپنی بیگناہی اور اپنی غیر فانی شخصی حضوری اور طاقت اور اپنے عجائب کاموں اور مطلب کے اعتبار سے آدمی سے بڑھکر ہے تو ہم اُسکی نسبت کیا کہیں؟ اِس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ ایسا جواب نہیں جو خبط پر مبنی ہو یا ناممکن الیقین۔ اور اِس کی دلیل یہ ہے کہ اُس سے نہ منطق اور نہ مذہب گریز کر سکتا ہے ؛

اِس دلیل کا عقلی یا منطقی پہلو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر

یسوع انسان سے جیسا کہ ہم انسان کا علم رکھتے ہیں بڑھکر تھا تو کیا ہم یہ کہیں
کہ وہ ایک غیر معمولی انسان یا فوق العادت شخص یا ایک نیم خدا تھا! ایسی بات
کو پیش کرنا ہی گویا اُس کے سقم کو فاش کرنا ہے۔ یہ دعویٰ نہ تاریخ میں اور
نہ تجربہ میں مسیح کی حقیقت کے شایاں ہے۔ اور ساتھ ہی ایسے اعتراضات
اِس دعوے پر کئے جا سکتے ہیں جنکا جواب دینا ناممکن ہے یسوع میں ایسی
باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو انسان کے ساتھ خاص ہیں۔ مگر اُس میں اور
باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو کہ خدا کے ساتھ خاص ہیں مثلاً اُسکا گناہوں کو
معاف کرنے کا دعوےٰ کرنا۔ یا ایسی قدرت رکھنے کا دعوےٰ کرنا جو انسان
کے اندر ایک نیا اخلاقی مخلوق پیدا کر دیتی ہے۔ پر یاد رہے کہ اُس میں کوئی
ایسی بات نہیں پائی جاتی جو نہ انسان کے ساتھ اور نہ خدا کے ساتھ خاص
ہے۔ جو اعتراضات ایک ایسی ہستی پر ہو سکتے ہیں کہ نہ انسان ہو اور نہ
خدا وہ ایسے صاف ہیں کہ ہمارے بیان کرنے کی حاجت ہی نہیں ہے
نیم الوہیت کو ماننا گویا پھر غیر قوموں کی بت پرستی میں گرفتار ہونا ہے۔
یہ ایرین خیال یا یوں کہیں کہ ایک طرح کا ایرین خیال جو مسیح کے متعلق
پیش کیا جاتا ہے نہ تاریخ میں اور نہ تجربہ میں کوئی بات اپنی موید پاتا
ہے اور فلسفانہ طور پر تو ہر ایک بات اُس کے برخلاف ہے۔ اس قسم
کا مسیح ایک ایسا مسیح ہے جسے کوئی اناجیل پڑھنے والا شخص پہچان ہی نہیں
سکتا۔ اور ٹی۔ جے۔ گرین صاحب (جنکے خیال سے ہمنے ایک جگہ اوپر
کنارہ کشی کی تھی مگر اب شکر گذاری کے ساتھ اُنسے اتفاق کر کے کہتے ہیں کہ
گرین صاحب) کے قول کے مطابق "کوئی فلاسفر جو قدیم طریقوں کی دیوپرستی
کو غلط سمجھ چکا ہے اِس بات میں اتفاق نہیں کر سکتا"۔ لازم ہے کہ اِس

بات کا مناسب اور پورا پورا موازنہ کیا جائے۔ہماری دانست میں جب کیم صاحب یسوع کی نسبت یہ کہکر کہ "وہ ایک فوق العادت معجزہ ہے" یا چیننگ صاحب یہ کہکر کہ "میں یسوع مسیح کو آدمی سے بڑھکر مانتا ہوں" آگے نہیں بڑھتے بلکہ اس بات کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں تو اُنکی اِس حرکت سے ایک مناسب شکایت برپا ہوتی ہے۔ اور وہ شکایت آدمی مذہب کی طرف سے نہیں بلکہ عقل کی طرف سے کرتا ہے۔ یا تو اُس کے متعلق ایسے الفاظ جیسے کہ مذکورہ بالا دو عالموں نے استعمال کئے ہیں سنجیدہ اور برحق ہیں یا وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر اُن سے وہی مطلب جو اُن سے صادر ہوتا ہے مراد نہیں تو پھر یہ کہنا چاہیئے کہ اِن لفظوں کو اِس واسطے استعمال کیا ہے کہ یسوع کے عظیم الشان مسئلہ سے نامناسب صورت میں پہلوتہی کیجائے۔ پر اگر وہ سنجیدہ اور ٹھیک اور موزوں الفاظ ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ایک ایسا اظہار ہمارے سامنے لاتے ہیں جس کا ثانی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اور جس کی تائید فلسفہ نہیں کرتا ؏

اگر یہ بات سچ ہے تو ہم کیا کہیں ؟ یہ کہ ایک ہی خیال باقی رہجاتا ہے اور وہ وہ ہے جس کی حقیقت کو ایک الہام یافتہ مصنف قدیم زمانہ میں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے اپنا قلم اُٹھایا اور بلا تشریح اور دلیل کے یہ الفاظ تحریر فرمائے **کلام خدا تھا**۔ اُس مصنف کی دقیقہ سنج باریک بینی کو لوگوں نے بہت ہی کم پہچانا ہے۔ وہ گویا یہ الفاظ کہا کئی مباحثہ کی صدیاں عبور کر گیا۔ اُس نے پہلی ہی نظر میں وہ بات دیکھ لی جسے ہماری تاریخ نے کافی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ مسیح کے متعلق تمام درمیانی قسم کے خیالات مثلاً ایریس کے خیالات وغیرہ نہ تواریخی طور پر اور نہ

منطقی طور پر درست ہیں۔ پس اس سوال کا فیصلہ کہ آیا وہ محض انسان ہے یا الٰہی شخص ہے اُس کے نزدیک بالکل صاف تھا۔ اس سوال کو سامنے رکھکر اُس نے مسیح کی حقیقت کو بیان کیا۔ اور اُس کے بیان کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایک اچھا بیان ہے یا کہ وہ ایک اعلےٰ درجہ کا بیان ہے۔ نہیں یہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ وہی ایک بیان پیش کرسکتا تھا۔ مسیحی ہونے کی حیثیت سے وہ مسیح کو محض ایک انسان نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسی طرح ہم بھی اُسے محض ایک انسان نہیں کہہ سکتے۔ اور عقلی پہلو پر غور کرکے وہ اُسے ایک درمیانی قسم کا خدا نہیں مان سکتا تھا۔ اسی طرح ہم بھی اُسے ایسا نہیں مان سکتے۔ اُس نے دیکھا کہ اگر میں اُس کی بابت کچھ لکھوں تو صرف ایک ہی بات لکھ سکتا ہوں۔ اسی طرح اگر ہم یہ بیان کرنا چاہیں کہ مسیح کیا ہے تو وہی ایک بات ہم بھی اُسکی نسبت کہہ سکتے ہیں۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ مسیح کی حقیقت کا یہ بیان ناممکن الیقین ہونے کے الزام سے صرف اُسی وقت بری ہوسکتا ہے جبکہ اُس کے عوض میں اور کوئی بیان معقول نہ ہو ؎

ہم نے اِس منطقی دلیل کو بہت مختصر صورت میں بیان کیا ہے۔ لیکن ہم اِس پہلو پر کچھ اور کہنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ایسا کرنا گویا ایمان کا خون کرنا ہے۔ علاوہ بریں روحانی صداقت کی حقیقت اِس طرح حقیقی اور یقینی طور پر معلوم نہیں کیجاتی۔ مگر یسُوع کی الوہیت صرف ایک ایسا منطقی نتیجہ ہی نہیں ہے کہ ہم اُسے ماننے کے لئے مجبور ہیں بلکہ وہ مسیحی تجربہ کی بھی جان ہے۔ مسیحی مسیحی ہونے کے سبب سے ایک بڑے گہرے طور پر اُس میں اُلجھا ہوا ہے اور اُسکے ماننے کیلئے مجبور ہے ؎

اب جو باتیں یہ حقیقت ظاہر کرتی ہیں کہ یسُوع کی الوہیت محض ایک منطقی نتیجہ ہی نہیں ہے جو مسیحی مذہب پر کتاب کے تتمہ کی طرح بڑھایا گیا ہے۔ بلکہ وہ مسیحی مذہب کی جان ہے۔ وہ باتیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں وہ حقیقت المسیح کے وہی مطالب ہیں جنپر ہم غور کرتے رہے ہیں یعنی مسیحی دیکھتا ہے کہ جو کچھ مجھے یسُوع سے ملتا ہے وہ صرف خدا کے متعلق تعلیم ہی نہیں ہے بلکہ وہ وہ زندگی اور قدرت ہے جو کہ خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ مسیح کی حقیقت میں سب کچھ جو کہ خدا میں ڈھونڈتا ہے پاتا ہے۔ اور جب وہ ابدی زندگی کی تعریف اِن لفظوں میں پڑھتا ہے "ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجکو (یعنی خدا کو) اور یسوع مسیح کو جسے تونے بھیجا ہے جانیں"۔ تو وہ از روئے مذہب خدا اور مسیح میں کسی طرح کا امتیاز نہیں مان سکتا وہ خدا کو مسیح سے دو نہیں بلکہ اُسی میں پاتا ہے یسوع کی انسانی زندگی اور شخصیت میں ہمکو نہ صرف ایسی انسانی زندگی اور شخصیت ملتی ہے جو ہمیں قوت کے ایک اونچے چشمہ کی طرف لیجاتی ہے۔ بلکہ ہم اُس میں اُس شخص کی حضوری اور طاقت کو محسوس کرتے ہیں جو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ میں خدا سے کم نہیں ہوں۔ جب یسُوع ہمارے ساتھ برتاؤ کرتا ہے اور ہمارے اندر کام کرتا ہے تو وہ اُس بات کو انجام دیتا ہے جسے صرف خدا انجام دے سکتا ہے۔ سارا مسیحی تجربہ اگر وہ ان باتوں پر صاد نہیں کرتا تو وہ کچھ بھی نہیں کرتا ہے۔ پر اگر یہ صحیح ہو تو اِس حالت میں بھی ایک ہی صورت ہے جس میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یسُوع کیا ہے۔ اور ہرمن صاحب نے بہت اچھی طرح اِس مطلب کو ادا کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "جب ہم یسوع کی الوہیت کا اقرار کرتے ہیں تو گویا ہم اُسے اُس کا اصلی نام دیتے ہیں" ہاں ہم اُسے جو ہمارے لئے اور ہم میں یقیناً اُسی طرح ہے جس طرح کہ خدا

ہوسکتا ہے اور کیا نام دے سکتے ہیں ؟ یسوعؔ کی الوہیت کا مسیحی مطلب یہی ہے۔ اور مسیحی عقائد کی اصطلاحی تعریفیں اِس سے دوسرے درجہ پر ہیں۔ واقعی آپ کے اِس دعوے میں کہ یسوع الہٰی شخص ہے کچھ حقیقت نہیں پائی جاتی اگر آپ کا یہ مطلب نہیں کہ یسوع آپ کے لئے وہی ہے جو فقط خدا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ آپ کے لئے ایسا نہیں ہے تو پھر مذہبی عقائد کی اصطلاحی تعریفیں محض لفظوں کا طومار ہیں۔ اور اگر وہ آپ کے لئے ایسا ہے تو گو یہ ممکن ہے کہ آپ کو اقنوم، تثلیث اور دیگر اصطلاحی محاورات سے جنکی صحت کے پرکھنے کے لئے تاریخی حالتوں کی یاد کو تازہ کرنیکی ضرورت پڑتی ہے کسی قدر ٹھوکر لگیگی۔ تاہم آپ اُسے اُسکے "اصل نام" کے سوائے اور کوئی نام نہیں دینگے یعنی جو کچھ وہ حقیقت میں ہے آپ وہی اُسے لفظوں میں پکارینگے "

علاوہ بریں تمام گہری اور سچی مسیحی زندگی اسی بنیاد پر ترقی کرتی ہے۔ اگر ہم یسوع کو صرف اپنا دوست یا اُستاد یا رہنما ہی نہیں بلکہ ایک عمیق معنے میں اپنا خداوند بھی جانیں تو مسیحی زندگی بھی بڑھیگی۔ یسوع کی خداوندی شخصی زندگی کے حقوق پر بھی چھا جاتی ہے۔ یعنی ہماری مرضیوں کو اور ہمارے دلوں کو اُسی کا ہونا پڑتا ہے۔ اور ہماری ضمیر بھی اُسی کے سامنے جسکا اختیار اور فیصلہ ہماری اپیل کا آخری اخلاقی مرجع ہے کوئی حقوق ایسے نہیں رکھتی جنپر اُسکا اختیار نہ چلتا ہو۔ اگرچہ عملی زندگی میں یہ کامل اطاعت وجود میں نہیں آتی تاہم خیال میں یہ بات مسیحی مذہب سے ایسی وابستہ ہے کہ اُس سے جُدا نہیں کیجاسکتی۔ اور یہ ایسا رشتہ ہے کہ ہم سوائے ایک کے اور کسی سے قائم نہیں کرسکتے۔ کیونکہ کسی اور کے ساتھ یہ رشتہ قائم کرنا

گویا عقلی اور اخلاقی طور پر اپنی ساری سیلف رسپکٹ اور آدمیت سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ ہاں یہ ایک ایسا رشتہ ہے کہ خدا کے ساتھ اور صرف اُسی کے ساتھ قائم کرنا ہماری سعادت کا باعث ہوتا ہے۔ پس اگر ہمارا یہ رشتہ یسوع کے ساتھ بھی ہے جو کہ مسیحی زندگی کا جزو اعظم ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اُسکی الوہیت کا اقرار کرنا گویا اُسے (جسکا عملی اقرار تمام مسیحی زندگی ہے) اُسکا اصل نام دینا ہے۔ زیادہ مختصر طور پر ہم اس بات کو یوں ادا کر سکتے ہیں۔ کہ ہم مسیحی نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ہم یسوع کو لفظی طور پر اور بغیر کسی قید کے "اُے میرے خداوند" نہ کہیں۔ پر کسی مخلوق کو ایسا کہنا ہمارے لئے روا نہیں ہے۔ پر اگر ہم اُسے "اُے میرے خداوند" کہیں تو ہمیں توما رسول کے ساتھ ملکر یہ بھی کہنا چاہیئے "اُے میرے خدا" وہ مسیحی جو اپنے خداوند کی الوہیت کا قائل نہیں وہ اپنی شخصی عزت اور آدمیت کو بھی قائم رکھنا مشکل پائے گا۔

پس یہی وہ سچا اور ناگزیر نتیجہ ہے جو اب ہمارے سامنے ہے یعنی یہ کہ یسوع سے مراد خدا ہے۔ چونکہ عقل یسوع کو ایک نیم خدا نہیں مان سکتی اور چونکہ مذہب اُسے ایک درمیانی قسم کا مکاشفہ نہیں مان سکتا اس لئے ہمیں بھی جو اُسے انسان سے زیادہ سمجھتے ہیں یہ کہنا چاہیئے "کلام خدا تھا"۔ یہ خیال ایسا حیرت افزا اور پُر زور ہے کہ اگر کوئی شخص ذرا بھی غور کرے تو اُسے یہ جاننا بھی مشکل ہوگا کہ اس کے ماننے کا مطلب کیا ہے ہاں اُس حالت میں بھی کہ جب کوئی شخص یہ مان لیتا ہے کہ تاریخی واقعات کا منطقی نتیجہ یہی ہے اور کہ تمام مسیحی زندگی اور تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ اس کا ماننا ضروری امر ہے یہ خیال پیچھا نہیں چھوڑتا کہ ایسا علم ہمسے بہت بلند ہے اور ہم اُسے

حاصل نہیں کر سکتے۔ بعض بعض مشکلات کا جو اس خصوص میں ہمارے سامنے رکھی جاتی ہیں بڑی دلیری سے مقابلہ کرنا چاہئے بلکہ انکی مخالفت کرنی چاہئے۔ مثلاً بعض بعض وقت اس کے متعلق ہمسے کہا جاتا ہے کہ ہم اب اُس زمانہ میں نہیں رہتے جو کوپرنیکس سے پہلے تھا اُس وقت لوگ ہمارے سیارہ (یعنی زمین) کی نسبت یہ خیال کیا کرتے تھے کہ وہ تمام عالم کا مرکز ہے اور کہ اُس کے باشندے غالباً خدا کی آنکھ کی پتلی ہے۔ مگر اب ہم پر یہ بات روشن ہوگئی ہے کہ وہ بے شمار دنیاؤں کے درمیان محض ایک نقطہ کے برابر ہے۔ پس ہم سے تمسخر کے ساتھ پوچھا جاتا ہے کہ کیا یہ خیال کرنا دیوانہ پن کا نشان نہیں ہے کہ اُس لامحدود سبب اوّل نے جس کی مختلف دنیائیں بے حد خلا میں پھیلی ہوئی ہیں سب سے چھوٹی دُنیا کے مخلوقوں میں سے ایک مخلوق کی صورت اختیار کی اور ہمارے درمیان خیمہ کیا؟ مگر یہ ایک ایسی کوشش ہے جو ہماری قوت متخیلہ کو ڈرانا چاہتی ہے۔ پس ہمیں اس کے سامنے مغلوب نہیں ہونا چاہئے۔ ہم باقیماندہ عالم موجودات کی نسبت کچھ نہیں جانتے۔ پس ناممکن نہیں کہ اس دنیا کو چھوڑ کر اور کسی دنیا میں عقلی اور اخلاقی زندگی ہو ہی نہ۔ اگر ایسا ہو تو اس دنیا کو باوجود اپنے قد کی چھوٹائی کے تمام خلقت کی چوٹی سمجھنا چاہئے پر اگر ایسا نہ ہو تو بھی آدمی آدمی ہی رہیگا۔ یعنی ایسا مخلوق جو خدا کے علم اور محبت اور جلال کے قابل ہے۔ آدمی تو ایسا ہی مخلوق رہیگا جیسا کہ وہ ہے خواہ کروڑوں دنیا اور موجود ہوں اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اور دُنیاؤں میں بھی اُس جیسے مخلوق پائے جاتے ہیں تو بھی وہ ایک بال برابر کم نہیں ہوگا۔ اس چھوٹی دنیا میں ایک روحانی معاملہ معرض خطر

میں تھا - بس یہ دنیا خدا کے نزدیک جو مادی اور اخلاقی دنیا کے باہمی درجوں سے واقف ہے چھوٹی دنیا نہیں ہے - اسی لئے طرطولین یہ سوال کرتا ہے "کیا مجسم ہونا خدا کی شان کے شایاں نہیں ہے"؟ اور پھر اس سوال کا یہ جواب دیتا ہے کہ مجسم ہونا اعلےٰ درجہ تک خدا کی شان کے شایاں ہے کیونکہ اور کوئی بات ایسی شایاں نہیں ہے جیسی ہماری نجات اُسکی ذات کے شایاں ہے"۔ جب مسٹر سپنسر ہم سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا ہم یہ بات مانتے ہیں کہ اُس موجد اول نے جسکی نہ خلا میں اور نہ وقت میں کوئی حد ہے اور جسکا ہمارا نظام شمسی لاکھواں حصہ بھی نہیں ہے انسان کی شکل اختیار کی"؟ تو وہ گویا اس سوال کی صورت میں خدا کا ایک عظیم الشان تصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے - پر ہماری رائے میں خدا کا کوئی تصوّر ایسا ادنےٰ نہیں ہے جیسا وہ جو اُسے ہمارے سامنے اِس صورت میں لاتا ہے کہ وہ بیشمار دنیاؤں کا لکھ پتی معلوم ہوتا ہے اور اپنے لاتعد مقبوضات کے سبب سے ایسا مادی بنگیا ہے کہ اُس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے روحانی فوائد کا خیال بالکل کھو بیٹھا ہے حالانکہ وہ فوائد ہزار ہا درجہ قیمت میں بڑھ کر ہیں ٭

اب ہم اس قسم کے اعتراضات کو تو دفع کر سکتے ہیں مگر وہ اصل مشکل جو خدا کے تجسّم کے ماننے کے متعلق محسوس ہوتی ہے قائم رہتی ہے - لہذا بڑی سے بڑی دلیل بھی مشکل سے اُس کی حقیقت کو ہمارے دلوں پر نقش کرتی ہے - صرف ایک ہی بات ہے جو اِس مشکل کو حل کر سکتی ہے ہاں صرف ایک ہی بات ہے جو ہمیں اِس قابل بناتی ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہیں کہ میں اسکا انکار نہیں کر سکتا" یا صرف یہ کہ "میں اسکا قائل ہوں" بلکہ یہ بھی کہ "میں اسپر ایمان لاتا ہوں" اور وہ ایک بات یہ ہے کہ ہم اُس کی ضرورت

کو محسوس کریں۔ یہ بات ایسی صحیح ہے کہ ہم یہ کہینگے کہ آپ سچے طور پر تجسم کو
ایک حقیقت نہیں جانینگے جب تک کہ آپ کچھ درجہ تک اُس کی ضرورت کو
محسوس نہ کریں۔ خدا کا مجسم ہونا ہمیں اُسی وقت ایک صداقت معلوم
ہوتا ہے جبکہ ہم پر یہ بات کھُل جاتی ہے کہ وہ ایسی صداقت ہے جو خدا
کی نظر میں ایک ضروری صداقت ہے۔ پس اگر ہمیں مسیح کی حقیقت کا یہ
عجیب مطلب قبول کرنا ہو تو ضرور ہے کہ ہم اِس مطلب کے مطلب کو
دریافت کریں۔ یعنی ہمیں یہ دریافت کرنا چاہئے کہ خدا کیوں انسان بنا؟

اِس سوال کا جواب مسیح کی حقیقت کا آخری مطلب ہے پس ضرور ہے
کہ اگلے باب میں اُسپر الگ بحث کیجائے لیکن اِس باب کے آخر میں
اور اگلے باب کے شروع میں گویا تمہید کے طور پر ایک بات عرض کیجاسکتی
ہے۔ اور وہ اُس تعلق سے وابستہ ہے جو تجسم کا تصور مسیح کی حقیقت کے
اُن مطالب سے رکھتا ہے جنپر ہم ابتک غور کرتے رہے ہیں یعنی ایمان
سے اور نیز اِس بات سے کہ مسیح کی حقیقت الہٰی سیرت کا مکاشفہ ہے۔
تجسم اور فقط تجسم ہی اکیلی وہ صداقت ہے جو ایمان کو خدا کی سیرت کے
ایک اعلےٰ اظہار سے مالا مال کرتی ہے۔ یعنی اِس اظہار سے کہ خدا محبت ہے۔

محبت کیا ہے؟ محبت رحیمانہ دلچسپی اور کریمانہ توجہ سے بڑھکر ہے
محبت کی چند خاص صفتیں ہیں۔ اور وہ قربانی اور خود انکاری ہیں۔ یعنی
محبّت اپنے آپ کو۔ خود کو دیدینے کا نام ہے۔ پس اگر ہم خدا کو محبّت کہنا
چاہتے ہیں تو ہمیں یہ کہنے کے قابل بننا چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو قربان کرتا
ہے اور خود غرضی سے بری ہے کہ وہ اپنی چیزوں میں سے دینے کو تیار
ہے۔ بلکہ اپنے آپ سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اب اگر خدا کا کلام یا پیغام

یا مظہر خدا کے ساتھ ایک نہیں یعنی خود خدا نہیں ہے تو لاریب الٰہی دلچسپی اور توجہ اور رحم کا اظہار تو دستیاب ہو جائیگا مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ اظہار محبت کا ایک لازمی اور صاف اظہار سمجھا جائے۔ کیونکہ اُس سے خدا کا اپنے آپکو دینا ظاہر نہیں ہوتا۔ لیکن محبت تو اپنے ہی آپ کو فدا کرنے کا نام ہے اب ہم یہ نہیں کہتے کہ اگر خدا ایسا نہ کرے تو محبت نہیں ٹھہریگا۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اُس حالت میں اُس کی محبت محبت کی صورت میں عمل نہیں کرتی اور نہ اُس صورت میں ہمپر ظاہر ہوتی ہے پر اگر یسوع مجسّم کلمہ ہے تو ضرور اِس میں خدا کی محبت ظاہر ہوگی اور ہم خدا کو اپنے آپ کو دیتے ہوئے دیکھینگے۔ اس میں کسی غیر کا بھیجنا نظر نہیں آئیگا بلکہ اُسکی اپنی ہی قربانی دکھائی دیگی۔ پس یہاں ایمان کے لئے ایک عظیم مکاشفہ موجود ہے۔ خدا صرف نیک اور مہربان شخص اور ہمیں جاننے اور ہماری مدد کرنیوالا ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایک سچے اور اصلی اور لفظی معنے میں ہمارا پیار کرنیوالا بھی ہے۔ یہ کیسا عظیم کلام ہے! "خدا نے جہان کو پیار کیا" کتنے ہیں جنہوں نے گو ابتک یہ تو نہیں سمجھا کہ "خدا نے دنیا کو خلق کیا" یا "خدا دنیا کا انصاف کریگا" کا کیا مطلب ہے پر اس بات کو سمجھ گئے ہیں؟ یہ بات تو اب مسیحی مذہب کا ایک عام مضمون بنگیا ہے۔ پر ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ کوئی بات مسیحی مذہب کو یہ کہنے کے لائق نہیں بناتی کہ خدا ہمیں پیار کرتا ہے۔ سوائے خدا کے تجسّم کے۔ کیونکہ اور کوئی بات خدا کے حقیقی طور پر اپنے آپ کو دیدینے اور اُس کی شخصی خود انکاری اور اُس قادر مطلق کی حقیقی محبت کو سوائے تجسّم کے ہمپر ظاہر نہیں کرتی ؀

پانچواں باب

حقیقت المسیح کا آخری مطلب

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو مطالب ہمنے حقیقت المسیح کے متعلق دریافت کیا ہے اُس کو جانیں تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ ہم پھر اس بات پر نظر ڈالیں کہ وہ حقیقت کیا ہے - جو مطلب ہمنے مسیح کی حقیقت میں پایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ الہی زندگی اور طاقت کا تجسم ہے - اگر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم اُسے حقیقت سمجھ کر قبول نہیں کرتے تا وقتیکہ ہمیں کچھ اس کی وجہ یا باعث معلوم نہ ہو تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم یاد کریں کہ تواریخی طور پر وہ تجسم کیا تھا - جیسا ہم اور جگہ کرتے آئے ہیں اُسی طرح اب پھر حقیقت المسیح پر ہی غور کریں ؛

اب اگر پوچھا جائے کہ اس کی ضرورت کیا ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اِس سوال پر غور کرنے کا ایک طریقہ ہے جس کے مطابق اگر اِس سوال پر تاریخی طور پر غور نہ کیا جائے بلکہ فلسفانہ طور پر کیا جائے تو وہ ایک ایسا حل اِسکا پیش کریگا جسے ہم حل نہیں کہہ سکینگے - مثلاً ہمیں کہا جاتا ہے کہ خدا کے مجسم ہونے کا تصور خدا کی ذات میں اور نیز اُس تعلق میں جو کہ وہ انسان سے رکھتا ہے مخلوط ہے - اگر خدا روح اور محبت ہے تو ضرور ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُنپر ظاہر کرے جنہیں اُس نے ایسے

مکاشفہ کو محسوس کرنے کے قابل بنایا ہے اور کہ یہ بات اُس وقت اپنے اعلےٰ درجہ کو پہنچتی ہے جبکہ خدا انسانیت میں اپنے آپ کو ظاہر فرماتا ہے ۔ پس خدا کا تجسم خدا کی زندگی کے عمل کا ایک حصّہ ہے اور اُسکی وجہ اور سبب اُسی کی زندگی میں ملتے ہیں ۔ اِس طرح کا استدلال ہیگل اور اُن سب فلاسفوں کے ساتھ خاص ہے جو مسیحی مذہب کا حل محض منطقی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ اور یہی رجحان بعض عالمان علم الٰہی کے درمیان نظر آتا ہے مثلاً وہ تصوّر جو الفاظ "پیدائش کی انجیل" سے مترشح ہوتا ہے اور جسے ڈاکٹر وسکٹ صاحب نے پیش کیا ہے اور جسکا مطلب یہ ہے کہ مُجسم کا وعدہ انسان کی پیدائش ہی میں مخفی ہے" بہت عالموں کو عمدہ معلوم ہوا ہے گو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب بڑے بڑے سمجھ بوجھوں نے بھی اُسے قبول کیا ہے ۔ اب یہ خیال بھی ایک طرح کی منطقی باریکی ہے جو بادی النظر میں تو بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن جب ہم تاریخ کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں تو اُسکی دلکشی کافور ہو جاتی ہے اور وجہ یہ ہے کہ فلسفہ اُسی وقت تک دلچسپ اور گراں قدر معلوم ہوتا ہے جب تک کہ وہ دنیا کے حقیقی واقعات پر رائے زنی کرتا ہے ۔ مگر اس طرح کا فلسفانہ خیال بہت کم سنجیدگی کے ساتھ معاملہ زیر نظر کے تاریخی واقعات پر لحاظ کرتا ہے ۔

اب یہ تو مانا جاتا ہے کہ خدا کا یہ ذاتی اظہار مسیح میں بہت اعلےٰ درجہ تک پہنچ جاتا ہے ۔ پر ہم پوچھتے ہیں کہ مسیح کیا تھا ؟ وہ وہ تھا جس کی نسبت کہا گیا ہے "اُس آدمی کو دیکھو" یہ الفاظ اُس وقت کہے گئے جبکہ وہ دکھ میں مبتلا تھا ۔ خدا کا ایک قسم کا آنا ایسا بھی ہے کہ وہ آدمی کے پاس اکیلا نہیں آتا ۔ بلکہ اپنے ساتھ غم اور پستی اور دکھ اور آنسوؤں اور

محنت اور پسینہ کو لیکر آتا ہے - خدا کا انسانی ہیئت میں ایک طرح کا دخل پانا ہے جو نہ صرف انسانی تکلیف میں گھسنے پر دلالت کرتا ہے بلکہ وہ ایک ایسی جانکنی میں داخل ہونے کا نام ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے اور نہ تفسیر ہے - اِسی قسم کا الٰہی اظہار مجسم ہوتا ہے - یہی وہ تجسم ہے جسپر ہمیں غور کرنا ہے - وہ نہ صرف بیت لحم ہے اور نہ صرف ناصرت ہے بلکہ گتسمنی اور کلوری بھی ہے وہ تجسم کا فلسفانہ تصوّر ہی نہیں ہے بلکہ تجسم کا تواریخی واقعہ بھی ہے - جب آپ صرف یہ کہتے ہیں کہ خدا کا انسان میں ظاہر ہونا خدا کی ذات میں جو کہ ایک پیار کرنے والی روح ہے بالطبع موجود ہے تو آپ کچھ بھی نہیں کہتے - کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ خدا کی ذات میں اُس الٰہی ذات کا تصوّر بالطبع موجود ہے جو آپ "مردِ غمناک" میں دیکھتے ہیں ؟ اس سوال پر غور کرنا ضروری امر ہے کیونکہ لازم ہے کہ ہمارا فلسفہ حقیقی واقعات کا ایک تصوّر ہو - ایک نہایت معزز مصنف جو مسیحی مذہب پر لکھنے والا ہے کہتا ہے - کہ "خدا کے تصوّر ہی میں وہ رشتہ شامل ہے جو وہ بنی آدم کے ساتھ رکھتا ہے اور جو مسیح میں ظاہر ہوا ہے" وہ رشتہ کیا ہے ؟ انسان بننا - مگر یہ واقعات کو ادا کرنے کا ایک ہلکا سا طریقہ ہے - کیونکہ اُسے محض ایک آدمی نہیں بننا تھا - بلکہ ایک خاص قسم کا آدمی بننا تھا اُسے "وہ آدمی" بننا تھا - وہ مردِ غمناک - وہ کانٹوں کے تاج والا آدمی بننا تھا - میں اُس آدمی کی طرف دیکھتا ہوں - میں اُس کے لامحدود غم کو جو بالاخانہ میں اُسپر طاری ہوا دیکھتا ہوں - اور اُس کی جانکنی اور اُس کے پسینہ کو بھی جو گتسمنی کے باغ میں بہا دیکھتا ہوں - میں اُسکے "اے باپ

اگر ہوسکے تو اُسے میرے خدا اے میرے خدا کہکر چلانے کو سُنتا ہوں ۔ اور میں پوچھتا ہوں کیا یہ رشتہ جو خدا انسان کے ساتھ رکھتا ہے "خدا کے تصوّر" میں شامل ہے تجسّم کے تصوّر کے متعلق خواہ کیسے ہی خیالات پیش کئے جائیں ۔ ہم یہ نہیں کہینگے کہ وہ خیالات تجسّم کے واقعہ کی شرح کرتے ہیں ۔ تاریخ کی طرف رجوع کرو تو دیکھو گے کہ ابھی اِس بارے میں بہت کچھ کہنا باقی ہے ۔ اُس خوبصورت اور پر لطف تجسّم اُس ہیبت انگیز اور پُر راز تجسّم کی علّت غائی اور بنیاد کی تلاش کرنا ابھی باقی ہے ۔

کیا وہ بہت کچھ جس کا بیان کرنا ابھی باقی ہے ہمیں کبھی معلوم بھی ہوگا اور کیا ہم اُسے بیان کرنیکے کبھی قابل ہونگے یا نہیں ہونگے ؟ جس صورت میں ہمیں اِس سوال کا جواب ڈھونڈنا چاہیئے یسوع اُسے خود روشن کر دیتا ہے ۔ جب اُسکی زندگی کے تاریک پہلو کا کٹھن وقت نزدیک آیا تو اُس نے فرمایا کہ میرا لہو بہتوں کے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا جاتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی شخص اُن الفاظ کی اصلیت پر جو عشائے ربانی کے تقرر کے متعلق قلمبند ہیں شک نہیں لاتا ۔ الفاظ مرقومہ بالا ایک کنجی ہیں اور یہ کنجی کافی ہے ۔ اور اُسے استعمال نہ کرنا عقل کے فتور کا نشان ہے ۔ پس اس تجسّم کا مطلب ۔ ہم کہتے ہیں کہ اِس تجسّم کا مطلب گناہ کی حقیقت میں ملتا ہے ۔ یسوع نے ایسا ہی کہا ۔ اور یہ کافی ہے ۔ اب اگر مسئلہ تجسّم کے حل کے لئے ہمیں اُس چیز (گناہ) کی طرف متوجہ ہونا ہے جو خود سب سوالوں سے زیادہ تاریکی میں ملفوف اور سب سے زیادہ مشکل اور مایوس کُن ہے تو بڑا افسوس ہے علاوہ بریں یہ چیز (گناہ) جس کی طرف متوجہ کئے جاتے ہیں سب مضامین

میں سے ایک ایسا مضمون ہے جس کی طرف رجوع کرنا ہماری طبیعت بالکل پسند نہیں کرتی - چنانچہ ہم اُس کی حقیقت پر جرح کرتے - اُسکے مطلب کو اُڑا دیتے ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اُسے کبھی اپنے اوپر شخصی طور پر چسپاں نہیں کرتے ہیں - پس چاہئے کہ ہم پھر اپنے آپ کو یہ کہیں کہ یسوع خود اُن لوگوں کی جو اُسے سمجھنا چاہتے ہیں اِس راہ کی پیروی کرنے کی (یعنی گناہ کی حقیقت پر غور کرنے کی) تاکید کرتا ہے آؤ ہم اُسی کو یہ کہتے سُنیں کہ اگر ہم صفائی سے گناہ کی حقیقت پر غور نہیں کرینگے تو ہم کبھی اِس قابل نہ ہونگے کہ یسوع کے مطلب کو پورے پورے طور پر بیان کریں ÷

گناہ کی حقیقت

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کا مطالعہ واقعی سنجیدہ اور پُر تاثیر ہو تو ہم یاد رکھیں کہ گناہ کا مطالعہ کرنا گویا اپنے ہی آپ کا مطالعہ کرنا ہے - تمام بنی آدم کے برخلاف ایک عالمگیر گنہگاری کا الزام عام طور پر برپا کرنا اور پھر اُسے واقعات اور نیز غیر قوموں کے اقوال کے ذریعہ سے ثابت کرنا بڑا آسان کام ہے - ایک یونانی شاعر جو اُن مصنفوں میں شامل ہے جو رقت انگیز قتلوں کو منظوم کیا کرتے تھے کہتا ہے کہ "گناہ سب بنی آدم میں پایا جاتا ہے - اور ایک رومی جو علم الاخلاق پر لکھنے والا تھا کہتا ہے کہ "ہم سب نے گناہ کیا ہے" اور موجودہ علم ادب اور خصوصاً موجودہ ناول اِس اقرار سے بھرے ہوئے ہیں - ناولوں کا تو یہ حال ہے کہ وہ نفرت انگیز

اور مخرب الاخلاق باتوں سے پُر ہوتے ہیں۔ اور یہ کہکر اپنے تئیں سرخرو کرتے ہیں کہ ہم تو وہی حال بیان کرتے ہیں جو فی الحقیقت وجود میں آتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ انسانیت کی گنہگاری کا یہ عام سا دعوٰے ضمیر پر کچھ اثر نہیں کرتا۔ یہ دعوٰے تو اِس قضیہ کی طرح ہے جو ہم اپنی منطق کی کتابوں میں شروع سے پڑھتے آئے ہیں کہ "تمام بنی آدم فانی ہیں"۔ ہم سب نے اِس کبریٰ کو مانا لیکن اس منطقی دعوٰے نے کبھی ہمیں یہ نہ جتایا کہ ہم بھی ایک دن مرجائینگے۔ گناہ بھی موت کی طرح ہے۔ موت کی طرح اس کی حقیقت بھی اُس وقت تک نہیں کھلتی جب تک کہ یہ ہمارے لئے ایک شخصی حقیقت نہیں بنتا۔ ہاں ہم اسے اُسی وقت محسوس کرتے ہیں جبکہ اُسے اپنے ہی متعلق جاننے لگتے ہیں۔ پس لفظ گناہ انسان کے نزدیک واقعی کوئی سنجیدہ معنی نہیں رکھتا جب تک کہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میں خود ایک گنہگار آدمی ہوں ؂

اب اگر انسانی گنہگاری کا عام قسم کا دعوٰے آدمی کو اُس کی شخصی گنہگاری سے آگاہ کرنے کے بارے میں کافی نہیں ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جو یہ نتیجہ پیدا کرسکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یسوع مسیح ہی یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ جب کوئی شخص گناہ آلود عشرت کی زندگی بسر کرکے اپنی جان کو مصیبت میں ڈال دیتا ہے تو ممکن ہے کہ اس سے اُسکو معلوم ہوجائے کہ بدی ضرور وجود رکھتی ہے اور کہ میں نے حماقت سے کام لیا پر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بھی پورے طور پر گناہ سے قائل ہونا نہیں ہے۔ اگرچہ آدمی کی ضمیر میں وہ قوت پائی جاتی ہے جو الزام لگاتی ہے۔ پر بارہا وہ قوت بھی ناکام رہتی ہے کیونکہ وہ بآسانی مردہ، اور گناہ آلود

ہو جاتی ہے اور اپنے الزاموں کو موثر کرنے میں بظاہر ناقص نکلتی ہے۔ یسوع مسیح ہی وہ شخص ہے جو زندگی کے فیصلوں کو تیز کرتا اور ہماری ضمیر کی آواز کو پھر زندہ کرتا ہے۔ وہ خود فرماتا ہے کہ میری ہی رُوح بنی آدم کو گناہ سے قصور وار ٹھہراتی ہے۔ پس ہم یہ خیال نہ کریں کہ جب ہم گناہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم یسوؔع کی چمکیلی اور پُر رحم حقیقت سے دور بھٹک جاتے ہیں۔ نہیں بلکہ اُسی حقیقت ہیں اور اُسی حقیقت کے وسیلے ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمنے گناہ کیا ہے ؁

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یسوؔع کا مطلب پورے پورے طور پر اور مناسب طور پر آدمی کی زندگی پر طالع ہوتا ہے تو وہ گناہ کے متعلق تین باتیں اُسپر آشکارا کرتا ہے ؁

پہلی یہ ہے۔ کہ اُس آدمی نے بہتر کو دیکھا اور رجانا لیکن جو برا ہے اُسے چنا اور کیا۔ اگر ہم اس الزام کی طرف صرف رجوع ہی کریں تو تو بھی یہ ہمارے دلوں پر ضرور اثر کریگا۔ بیشک ہم نے اُسے جو بہتر ہے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ہم نے نہ صرف حقیقت مسیح کو دیکھا جو کہ اُس بیان کے مطابق جو کہ ایک پہلے لکچر میں پیش کیا گیا تاریخ سے بہت بڑھکر ہے بلکہ ہماری زندگی بھی اور نیچر بھی ان سوالوں کو بارہا ہمارے سامنے لائی۔ پس ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی حیوانوں کیطرح زندگی کی بہتر راہ کے علم سے بے بہرہ ہیں۔ تو بھی ہم نے خیالاً قولاً اور فعلاً وہی جو بدتر ہے چنا اور کیا۔ ہم اس بات کو عام معنی کے مطابق نہیں بلکہ خاص طور پر جانتے ہیں۔ اور پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ بات ہم سے بعض بعض مواقع پر یا کبھی کبھی سرزد نہیں ہوتی بلکہ یہ ہماری زندگیوں کا

خاصہ ہے۔ ہم گذشتہ سال کو یا گذشتہ ہفتہ کو یا کل کو یاد کرتے ہیں اور ہم اُس بُری عادت یا سخت لفظ یا کمینے خیال کو یا خود غرض فعل کو یاد کرتے ہیں جو ہم سے سرزد ہوا۔ ہم گناہ کی کوئی خاص صورت یعنی کسی الجھانے والے گناہ کو لیتے ہیں اور ہم گننے لگتے ہیں کہ وہ کتنی دفعہ ہم سے سرزد ہوا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اُس کا شمار ہمارے سر کے بالوں سے بھی زیادہ ہے۔ اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تمام زندگی اُسی گناہ میں بسر ہوئی۔ اور کہ ہماری ساری سیرت میں اُسی کی بو آتی ہے۔ اور ہماری ساری نیچر میں وہی سرایت کئے ہوئے ہے۔ ہم اِن الفاظ میں کسی مشہور بدمعاش کا خاکہ نہیں کھینچ رہے ہیں اور نہ ہم نہایت قبیح گناہوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اوسط درجہ کے آدمی کو بھی جس کی ضمیر کا سابقہ متعلق زندگی کی حقیقتوں کے یسوع سے نہیں پڑا۔ اپنی زندگی کے گذشتہ سال پر نظر ڈالنے دو۔ مگر ایسے دل اور دماغ کے ساتھ کہ جو اُن باتوں کے لئے کھلا ہو جو ہم مسیح کی حقیقت میں پاتے رہے ہیں۔ اور کیا وہ یہ نہیں دیکھیگا کہ میرا اُبھرا ہوا اور گہرا خیال میری زندگی کی روزانہ عادت اور میرا روزمرہ کا معمول مسیح کے پاس آنے سے پیشتر یہ نہ تھا کہ میں اعلےٰ قسم کی باتوں کو اختیار کرتا اور عزیز جانتا۔ بلکہ میرا حال یہ تھا کہ دنیاوی "جسم کی خواہش" یا کوئی دنیاوی "آنکھ کی خواہش" یا شاید سب سے زیادہ کوئی چھوٹی سی "زندگی کی شیخی" وبالِ جان ہو رہی تھی جس میں میں بے ہچکچائے گرفتار ہو جاتا تھا اور ذرا شرم محسوس نہیں کیا کرتا تھا۔ لیکن اب مسیح کا دامن پکڑنے کے بعد میں اُسے خوب محسوس کرتا ہوں اور اپنے سامنے بھی اُس کا اقرار کرتے ہوئے شرماتا ہوں ؎

اس سے ایک اور بات بھی پیدا ہوتی ہے - یا یوں کہیں کہ دوسری بات جو یسوع کی رُوح ہم پر گناہ کے متعلق ظاہر کرتی ہے - ایسی شخصی اور ذاتی ہے کہ اُس کا بیان صیغۂ متکلم میں ہی کرنا زیب دیتا ہے - وہ (یعنی مسیح) مجھ پر اس بات کو بھی آشکارا کر دیتا ہے کہ کسی اور میں یہ باتیں ہوں یا نہ ہوں مگر مجھ میں اِن کا ہونا کسی عذر کی بنا پر معاف نہیں کیا جا سکتا - دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ وہ مجھ پر آشکارا کرتا ہے کہ میں اوروں کی طرح عام طور پر گنہگار ہی نہیں ہوں بلکہ مجرم اور قابل تعذیر بھی ہوں یہ بات میں اوروں کی نسبت بعینہٖ اُسی طرح نہیں کہہ سکتا جس طرح کہ اپنی نسبت کہہ سکتا ہوں - چنانچہ میں اُن کی نسبت یہ خیال کرنے لگ جاتا ہوں کہ شاید اُنکے پاس ہزاروں معقول عذر ہونگے اور ضرور ہونگے پس میں اُنہیں بغیر فریسیوں کی سی متکبر طبیعت رکھنے کے قابل فتویٰ نہیں گردان سکتا - لیکن اگر میں اپنا موازنہ آپ کروں تو اُسے کوئی شیخی اور غرور کی بات نہیں کہے گا - اس میں شک نہیں کہ مجھ پر بیرونی اسباب اور اندرونی خواہشات کی وجہ سے طرح طرح کی آزمائشیں آئیں تاہم میں اُنکے سبب سے اس الزام سے بری نہیں ہو سکتا کہ میں سزا کے لائق ہوں - اور اس کے دو سبب ہیں - پہلی بات یہ ہے - کہ بیرونی اسباب اور اندرونی خواہشات کے سبب سے خواہ کچھ ہی مجھ پر وارد ہوا ہو پر اس میں کچھ شک نہیں کہ مینے نہ صرف بدی کی بلکہ اُسے پسند بھی کیا - یہ بدی کی محبت جسنے مطلوبہ بیرونی اسباب کو پیدا کیا اور ساتھ ہی اپنے حسب حال میرے اندر ایک جذبہ کو بھی برپا کیا ایک ایسی حقیقت ہے جسے میں اپنے دلکے متعلق تو خوب جانتا ہوں - مگر

دوسرے کے دل کے متعلق ایسی اچھی طرح نہیں جانتا اب اسکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ میں اپنے اوپر ایسا فتوے لگاتا ہوں جیسا کہ کسی اور پر نہیں لگا سکتا علاوہ بریں ایک بات ہے جو میں اپنی ہی نسبت جانتا ہوں اور دوسری کی بابت نہیں جانتا یعنی میں اُن موقعوں کو جانتا ہوں جو اچھے انتخاب اور بہتر طریقہ اختیار کرنے کے متعلق میرے سامنے آئے۔ میں اُن خاص بواعث اور وجوہات کو جانتا ہوں جو میری زندگی کے تجربہ سے برپا ہوئیں اور جنکی بنا پر چاہیے تھا کہ میں ایک نیک آدمی بن جاتا۔ میں اس فضل کے اظہار کو اور اوس رحمت کے فعل کو جو میری پرورش کے متعلق وجود میں آیا یاد کرتا ہوں۔ اسی طرح اُن دھمکیوں کو جو زندگی کی تربیت کے متعلق وقوع میں آئیں دیکھتا ہوں اور اسی طرح اِس سوچ کے موقعہ اور اُس نیکی کے اشتعال پر جو زندگی میں پیش آیا غور کرتا ہوں اور پھر میں اِن سب باتوں کو گنتا ہوں غرضیکہ اِن سب باتوںکو جو مجھ سے تعلق رکھتی ہیں خوب جانتا ہوں پر اپنے ہمسایہ کی نسبت اِن باتوں میں سے کسی بات کو نہیں جانتا۔ پس میں دیکھتا ہوں کہ بنی آدم کو عام طور پر گنہگار سمجھنے یا کسی اور شخص پر الزام لگانے کی بجائے میں خود ایک شرمناک صورت میں جو کسی طرح معاف نہیں ہو سکتی گنہگار آدمی ہوں اسکا مطلب یہ ہے کہ جس اصول کے مطابق میں اوروں پر فتوے نہیں لگا سکتا اُسی اصول کے مطابق اپنے آپ کو فتوے کے لائق سمجھتا ہوں۔ اس اصول کو شاعر برنز کی نسبت اور کسی شخص نے زیادہ صفائی کے ساتھ بیان نہیں کیا ہے وہ کہتا ہے کہ "جو باتیں کیجاتی ہیں اُنہیں تو ہم کچھ کچھ گن سکتے ہیں لیکن جن باتوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے اُنہیں ہم نہیں جانتے ہیں" یہ بات بالکل صحیح ہے ہم برنز کی مغموم اور مایوس زندگی کا فیصلہ نہیں کرینگے۔ پر یاد رہے کہ یہ بات دونوں طرف

وار کرتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ آدمی کہتا ہے کہ میں غیر کا فیصلہ تو نہیں کرونگا مگر اپنا کرونگا۔ کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ مینے اپنے دل میں کن باتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ میں اُس فضل کو جانتا ہوں جس کا مقابلہ میں نے کیا ہے اور میں اس بات میں اپنے اوپر فتوے لگاتا ہوں اور بنین صاحب کی طرح محسوس کرکے لکھتا ہوں" ہر ایک شخص میری نسبت ایک بہتر دِل رکھتا ہے"۔ اِسی طرح ایک اور مصنّف جو اِس مضمون پر لکھنے کی مشق رکھتاہے کہتاہے ۔"خدا نے کسی شخص کو ایسی طاقت نہیں دی کہ وہ سوائے اپنے گناہ کے کسی اور گناہ کی اصل وسعت کو جان سکے۔ لہٰذا سب سے بڑا گنہگار جو اُسے معلوم ہے وہ آپ ہی ہے" یہ بات لفظ بلفظ صحیح ہے۔ اور یہی وہ طریق ہے جس میں ہر ایک شخص جس نے یسوع مسیح کی رُوح سے یہ سیکھا ہے کہ میری ہی اپنی زندگی گناہ سے پُر ہے رسول کے ساتھ متفق ہوکر اور صاف صاف وجوہات کی بنا پر اپنے آپکو "سب گنہگاروں سے بڑا" جانتا ہے ؛

اِس سے ہم تیسری بات پر پہنچتے ہیں۔ ہم اپنے آپ پر فتوے لگاتے ہیں کیونکہ ہم اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ لیکن یسوع جس کی نسبت سامریہ کی عورت نے یہ کہا کہ جو کام مینے کئے ہیں اُس نے مجھے بتا دئے ہیں ہم پر اِس بات کو نئی سنجیدگی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ نہ صرف ہم ہی اپنے آپ کو جانتے ہیں بلکہ ایک اور بھی ہے جو ہمیں جانتا ہے۔ اور وہ "ایک اور" جو ہمیں جانتا ہے محض ایک انسانی عادِل نہیں ہے۔ وہ وہ ہے جس کی نسبت ہم یہ کہا کرتے ہیں" لیکن خدا کیا کہیگا؟" وہ زندہ اور پاک اور شخصیت والا خدا ہے جس کی ہستی کی نسبت یسوع نے ہمیں خوب

قائل کر دیا ہے۔ کیا وہ فتوے جو وہ لگاتا ہے اُس فتوے سے جو ہم آپ اپنے اوپر لگاتے ہیں کمزور اور کم سنجیدہ ہے؟ وہ نیک ہے مگر وہ نیکی کی محبت کو گناہ کی نفرت میں ظاہر کرتا ہے؟ وہ کیا کہیگا؟ واضح ہو کہ جو کچھ ہم حقیقت میں ہیں خدا اُس سے مختلف ہمیں تصور نہیں کر سکتا پر ہم حقیقت میں کیا ہیں؟ اسی بات کو ہم ابھی ابھی دریافت کر رہے تھے۔ ہم وہ ہیں جنہوں نے بہتر کو جانا مگر بدتر کو کیا۔ اور ہم اس کے لیئے کوئی معقول وجہ پیش نہیں کر سکتے بلکہ برعکس اس کے ہم جانتے ہیں کہ ہم نے طرح طرح کی بدلگامیوں کے ساتھ اُن بُری باتوں کو کیا حالانکہ ہزاروں ایسی رکاوٹیں اور دلیلیں موجود تھیں جو ہمیں اُنکے ارتکاب سے روک سکتی تھیں۔ اگر خدا خدا ہے۔ اگر خدا اخلاقی خوبیوں کے اعتبار سے خدا ہونے کے قابل ہے تو غور کرنا چاہئے کہ اسکا تعلق ایسے لوگوں کے ساتھ کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے اِن خیالوں کے سبب سے ہمارا مذہب ایک مایوس جگہ پر آکر ٹھہر جاتا ہے اور تلاشِ خدا ایک تاریک خیال سے گھِر جاتی ہے یعنی ہم ڈر کے مارے سوچنے لگ جاتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم حقیقت میں خدا کے نزدیک آجائیں یا وہ ہمارے نزدیک آجائے۔ یعنی ہم ڈرتے ہیں کہ اگر ایسا ہوا تو ہم بھسم ہو جائینگے۔ پھر تو وہ آرزو جو ان لفظوں سے مترشح ہوتی ہے میری روح.... زندہ خدا کیلئے ترستی ہے کب میں جاؤں اور خدا کے حضور حاضر ہوؤں اِن لفظوں میں تبدیل ہو جاتی ہے "میں خدا کی حضوری سے کہاں بھاگوں" یعنی ہم خدا کے خیال ہی کو ناپسند کرنے لگ جاتے ہیں اور آئندہ کے خیال سے بھی کنارہ کشی کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہماری خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم خدا کو بھول جائیں اور نیز یہ کہ ایسی باتوں کو جو خدا کو یاد دلاتی ہیں

مثلاً موت جیسی بات کو بالکل نظر انداز کر دیں"۔ یوں ہماری ضمیر ہم سب کو بُزدل بنا دیتی ہے۔

کیا یہ خیالات نامناسب اور کمینے خیالات ہیں؟ کیا یہ اُن تاریک اور دہشت زدہ خیالات کی طرح ہیں جو غیر قوموں کو ستاتے ہیں جن پر کہ مسیح کا شفا بخش نور طالع نہیں ہوا ہے؟ ان خیالات کی نسبت ایسا کہنا آسان ہے مگر درحقیقت یہ ایسے نہیں ہیں۔ ایمان کے لئے حقیقت المسیح سے جو مطلب مترشح ہوتا ہے وہ اُس ڈر اور خوف کو دور کر دیتا ہے جو اس خیال سے برپا ہوتا ہے کہ خدا شریر یا بے انصاف یا ناپاک ہے۔ لیکن وہ سنجیدہ ڈر جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو گنہگار سمجھتا ہے وہ تو اِس خیال سے پیدا نہیں ہوتا کہ خدا شریر اور بے انصاف اور ناپاک ہے بلکہ برعکس اس کے وہ اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ خدا راستباز اور عادل اور پاک ہے۔ دوسری صورت میں یوں کہیں کہ یہ ڈر خدا کے صحیح نہ کہ غلط تصوّر سے پیدا ہوتا ہے۔ اب اِس قسم کے ڈر سے طرح طرح کی باتیں ہمیں بچانا چاہتی ہیں مگر وہ سب بے ایمانی کی روح سے ہیں وہ عشرت کے خواب آور نسخے ہیں اور اس فیصلہ کی جھلک ہیں کہ "خدا ہے ہی نہیں"۔ حقیقت المسیح اِن خوفوں کو بے بنیاد اور حماقت آمیز خواب نہیں سمجھتی۔ وہ اُنہیں خود پیدا کرتی اور گہرا بناتی اور ہماری ضمیر کو یہ توفیق بخشتی ہے کہ ہم انہیں ازلی اخلاقی صداقتیں تصوّر کریں۔ اور وہ (یعنی مسیح) ہمیں نہ صرف گناہ سے قائل کرتا بلکہ "سزا کے حکم" سے بھی قائل کرتا ہے۔ پس ہم کسی طرح کی عقلی ابتری اور زود اعتقادی کے نقائص میں مبتلا ہوتے بغیر۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اخلاقی دانش اور سنجیدگی سے ملبس ہو کر

یہ سوال کرسکتے ہیں کہ جب ہم اپنی ضمیر کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے۔ تو اُس کے سامنے جو دِلوں اور گردوں کا جانچنے والا ہے کِس طرح کھڑے ہونگے؟ اور کِس طرح بدی کے پُر زور احساس سے بچ نکلینگے؟ فقط کامل لوگ ہی خدا کے سامنے کھڑے ہوسکتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اِس سوال سے روگردانی کرسکتے ہیں۔ اور دو صورتوں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ کبھی اس بات پر کہ خدا کیا ہے سوچنا پسند ہی نہ کریں اور دوسری یہ ہے کہ ہم یہ جاننا بھی روا نہ رکھیں کہ ہم خود کیا ہیں۔ اگر چاہیں تو ہم اس طرح اِس سوال سے گریز کرسکتے ہیں۔ پر ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ سوال پھر بھی معدوم نہیں ہوتا بلکہ قائم رہتا ہے ٭

اب اِس سے ظاہر ہوا ہوگا کہ گناہ کا سوال زیادہ گہرا اور زیادہ تاریک سوال ہے۔ وہ سیرت کے اخلاقی سوال کی نسبت کہیں زیادہ گہرا ہے۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں ایک سیرت کا مسئلہ بھی ہے۔ بدی بدعادتوں کا اور گناہ آلود خواہشوں کا پھل لاتی ہے اور نیز اسی زندگی میں اُس سے کئی جسمانی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں جو بدی پائی جاتی ہے اُسکا یہی پھل نہیں ہے۔ کیونکہ اُس میں اِن دُنیاوی پھلوں کے علاوہ اور پھل بھی لگتے ہیں۔ یعنی اُس سے وہ نتائج بھی پیدا ہوتے ہیں جو خدا سے علاقہ رکھتے ہیں۔ پس یہاں ایک اور بات ہے جو ہم نے ابھی دیکھی ہے اور جو اُس وقت جبکہ ہم حقیقت المسیح کے پہلے مطلب پر غور کررہے تھے ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ پس بداخلاقی یعنی انسان کی سیرت کا مسئلہ جبکہ اکیلا وہی مدنظر ہو تو بمقابلہ گناہ کے ایک چھوٹی سی بات ہے۔ یعنی جب سیرت پر اِس بات کو مدنظر رکھکر غور

کرتے ہیں کہ انسان فتوائے الٰہی میں مبتلا ہے تو محض سیرت کا سوال بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے ۔

دیکھو ہماری تحقیقات میں ہمیں کیسی ابتری اور گڑبڑی نے آگھیرا ہے! مسیح کی جس حقیقت نے ہمارے سامنے خصلت اور ایمان کے متعلق فرحت بخش اور ہمت افزا امیدوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ اسی حقیقت نے اُنہیں اب تاریکی کے بادلوں سے گھیر لیا ہے۔ اور ایسے نئے معانی پیدا کر دئے ہیں جو بظاہر ہماری امید اور خوشی کو بھی چکنا چور کر رہے ہیں ذرا ہم اس فتوائے الٰہی پر جو گناہ پر لگایا گیا ہے غور کریں اور نیز اپنے اوپر اپنے آپ کو گناہ کرنے والے سمجھکر نظر ڈالیں۔ یہ کہنا کہ یہ فتوائے سزا ہے گویا اسی بات کو دوسرے لفظوں میں دُہرانا ہے۔ کیونکہ سزا کیا ہے سزا وہ خفگی ہے جو فعل کی صورت میں نظر آتی ہے۔ مگر تاہم گناہ کا فتوائے سزا سے کہیں بڑھکر ہے۔ وہ ہر ایک نیکی کا ضائع ہونا اور ہر بھلائی کی امید کا چھن جانا ہے۔ اب کیا یہی وہ نتیجہ ہے جس تک یسوع نے اِن ساری باتوں کے بعد ہمیں پہنچایا ہے۔ کیا یسوع کی حقیقت ہینؔ کی غزلوں کی مانند ہے جو خوبصورتی اور سلامتی کے خیالوں کے ساتھ شروع ہوتی ہیں مگر مقطع پر آکر ہمیشہ کسی تلخ لفظ یا ناامیدی سے بھرے ہوئے فقرے سے ساری امیدوں کو پاش پاش کر دیتی ہیں؟

ہم یاد رکھیں کہ گناہ کی بھیانک حقیقت کو ظاہر کرنا اور یہ بتانا کہ خدا اُس کی نسبت کیا سوچتا ہے۔ یسوع کا آخری کلام نہیں ہے۔ پس لازم ہے کہ ہم اپنے مطالعہ میں ذرا اور آگے بڑھیں ۔

۲۔ معافی

ایک اور بات جو کہ مسیح کی حقیقت میں پائی جاتی اور اس بات سے علاقہ رکھتی ہے کہ گناہ کیا ہے اور خدا اُسے کیا سمجھتا ہے۔ بہت تھوڑے لفظوں میں بیان کیجا سکتی ہے۔ اور اس پر بحث کرنے کی حاجت بھی نہیں ہے۔ وہ روشنی اور آزادی جو مسیح اپنے ساتھ اُس وقت لاتا ہے جبکہ وہ صاف دلی اور خوشدلی سے قبول کیا جاتا ہے۔ یہ ظاہر کرتی ہے کہ خدا ہم سے خفگی کے ساتھ پیش نہیں آتا اور نہ ہمپر فتوے لگاتا ہے۔ بلکہ وہ ہمارے ساتھ بڑی مہربانی اور تپاک سے پیش آتا ہے۔ اگر یہ بات درست نہ ہو تو انجیل کا کلام اور مسیح کا تجربہ محض ایک دھوکا ہیں۔ مسیح میں ہم اس بات کے لئے بُلائے جاتے ہیں کہ ہم خوشی کے ساتھ خدا پر بھروسہ کریں اور اُس سے نقصان کی نہیں بلکہ بھلائی کی توقع رکھیں۔ اور ہمیں یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ ہمارے برخلاف نہیں ہے۔ بلکہ اب بھی ہماری طرف ہے اور ہمیشہ تک رہیگا۔ اگر مسیح کا پیرو یہ سب باتیں حقیقت المسیح میں دیکھے اور پھر اُن کو خدا کی نسبت دائمی اور حقیقی صداقتیں سمجھکر اُنپر تکیہ نہ کرسکے تو پھر یہ کہنا چاہئے کہ یسوع نے ہمارے دلوں کو گمراہ کر دیا ہے ؛

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ فقط ایک ہی لفظ ہے جو اِس مشکل کو جو درپیش ہے حل کرسکتا ہے۔ یعنی اُس فضل اور ایقانِ نجات کے

درمیان جو خدا کی ذات سے ہمارے لئے صادر ہو رہے ہیں۔ اور اُس خفگی اور فتوٰے کے درمیان جو وہ گنہگاروں کے لیئے رکھتا ہے جس کی تصدیق حقیقت المسیح سے ہوئی تطبیق پیدا کرتا ہے۔ غور کیجئے کہ اِن دو متضاد باتوں میں ہمیں تطبیق پیدا کرنا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ایک بات کو تو ہم اپنے دل میں جگہ دیں۔ اور دوسری کو نکال دیں یا بھُلا دیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہمیں قبول کرتا ہے اور اپنے پاس جگہ دیتا ہے۔ ہم اُس وقت یہ بھی یاد رکھیں کہ ہم گناہ سے بھرپور ہیں اور خدا کا چہرہ ہم سے پھرا ہوا ہے۔ پس لازم ہے کہ اِن دو مختلف باتوں میں مطابقت دکھائی جائے۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ صرف ایک ہی لفظ ہے جو اُنمیں مطابقت پیدا کرتا ہے اور وہ لفظ معافی ہے۔ معافی میں اوّل تو گناہ کی حقیقت کا اقرار مخفی ہے۔ کیونکہ اگر گناہ کچھ چیز نہیں ہے تو معافی کس چیز سے ہوگی۔ نیز اس میں خدا کی آزاد مہربانی کی حقیقت کا اقرار نہاں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں تو ہم کبھی معاف نہیں کئے گئے۔ پس ہم فی الحقیقت گنہگار ہیں اور خدا نے ہمیں واقعی قبول کیا اور اپنے پاس جگہ دی ہے۔ جب یہ دونوں باتیں مِل جاتی ہیں تو ان کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ خدا نے ہمیں معاف کر دیا ہے ؛

اب یہ نتیجہ جو ہم نے نکالا شاید ناظرین کو بہت سادا سا معلوم ہوا ہوگا۔ مگر وہ ایک سادہ سا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اِس بات میں ہم گناہ کے مسئلے پر آجاتے ہیں یعنی گناہ کی معافی کے مسئلے تک

پہنچ جاتے ہیں۔ ہم میں یہ رغبت پائی جاتی ہے کہ ہم اس بات کو کہ خدا معاف کرتا ہے ایک عام اُصول تصوّر کرلیں۔ پس مناسب ہے کہ ہم ذرا توجہ سے اور ٹھیک ٹھیک طور پر اس بات کے متعلق کہ خدا کے نزدیک گناہوں کو معاف کرنا کیا مطلب رکھتا ہے غور کریں ؛

ہاں ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ گناہ کو معاف کرنا جو مطلب ہمارے نزدیک رکھتا ہے وہی خدا کے نزدیک رکھتا ہے۔ اور کہ جو کچھ اُس وقت وقوع میں آتا ہے جبکہ ایک شخص دوسرے شخص کو جو اُسے نقصان پہنچاتا ہے معاف کرتا ہے اُس وقت واقع ہوتا ہے جبکہ خدا ہمارے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ مثلاً پریسٹلی صاحب جو نہایت صاف دل اور صداقت پسند آدمی ہیں کہتے ہیں کہ ہم سے یہ طلب کیا جاتا ہے کہ اگر ہمارا بھائی توبہ کرے تو ہم اُسے معاف کریں خواہ اُس سے دن بھر میں سات دفعہ وہی قصور سرزد کیوں نہ ہو۔ پس ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسی فیض معمور اُصول کے مطابق خدا ہمارے گناہوں کو معاف کرتا ہے "یہ نتیجہ بادی النظر میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس سے گریز ہو ہی نہیں سکتا۔ اور کہ اگر ہو سکتا ہے تو اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم (سوسی نس کے قول کے مطابق جس سے یہ دلیل لیگئی ہے) "خدا کو اُتنی طاقت بھی نہ دیں جتنی کہ انسان کو دیتے ہیں" پر اگر ہم اس بات کو ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو ہم پر ظاہر ہو جائیگا کہ یہ نتیجہ ہمارے سامنے ایک ایسا تصوّر خدا کی ذات کا لاتا ہے جو

ناقص ہے۔ بات تو درحقیقت یہ ہے کہ ہم خدا کو انسان سے کم نہیں بلکہ ہزار ہا درجہ زیادہ طاقت دینا چاہتے ہیں۔ اور ہم سوسی نن کو وہی جواب دیتے ہیں جو ایک مرتبہ لوتھر نے ای ریس مس کو دیا جبکہ وہ آپس میں مرضی کی آزادی پر بحث کرتے تھے۔ اور وہ یہ تھا خدا کی نسبت تمہارے خیالات بالکل انسانی ہیں"۔

آپ تھوڑی دیر کے لئے اُس اصلی فرق پر غور کریں جو اُن رشتوں میں پایا جاتا ہے جو خدا اور انسان موریلیٹی سے یعنی اخلاق کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ہم تو محض مخلوق ہیں اور ہمارا اپنے نقصانات سے جو دوسروں کی دست اندازی سے وقوع میں آتے ہیں درگذر کرنا ہرگز یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ قانون جس کے وسیلے سے بقول افلاطوں بدی اور بدی کا نتیجہ "آپس میں جکڑے ہوئے ہیں" منسوخ ہو جاتا ہے۔ دنیا کا اخلاقی سلسلہ ہم پر منحصر نہیں ہے اور نہ وہ ہمارے اس قسم کے افعال سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس ہم صرف ایسے مخلوق ہو کر کہ جن کو اس سلسلہ عامہ میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ ایک دوسرے کو معاف کر سکتے ہیں اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ اگر ہمارے معاف کرنے سے ایسی اخلاقی اور عام تاثیریں پیدا ہونگی کہ جن سے جماعت کے اخلاقی انتظام میں خلل آئیگا تو ہمارا معاف کرنا روکا جائیگا اب خدائے قادر تو کوئی اس قسم کا مخلوق نہیں ہے جس کی نسبت ہم یہ خیال کریں کہ وہ بھی ہماری مانند ہے اور کہ اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ وہ ہم سے ذرا بڑا ہے نہیں۔ وہ دنیا کے اخلاقی انتظام کا منبع اور مرکز ہے اور یہ انتظام اُسی پر

مبنی ہے۔ پس وہ اصل اور سچا رشتہ جو بدی اور بدی کے فتوے میں پایا جاتا ہے فقط اُسی وقت منسوخ ہوگا۔ جب کہ وہ اُسے منسوخ کرے۔ مگر اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اخلاقی بدانتظامی اور اخلاقی ابتری پیدا ہوگی اور پھر دنیا اخلاقی انتظام والی دنیا نہیں رہیگی۔ اب اس قسم کی معافی خدا کے لئے ایک ایسا واقعہ ہوگا جسمیں اخلاقی بدنظمی ملی ہوئی ہوگی۔ سو یہ بات نہایت ضروری ہے کہ یہ اصل فرق جو اس معاملہ کے متعلق خدا میں اور ہم میں پایا جاتا ہے خوب دیکھ لیا جائے۔ زمانہ حال کا ایک امریکن تھیولوجین بار بار یہ کہتا ہے کہ یہ معافی کا معاملہ ایسا معاملہ نہیں ہے "جس کا تعلق قانون سے یا گورنمنٹ سے ہو بلکہ یہ ایسا معاملہ ہے جو اُس رشتہ کو ظاہر کرتا ہے جو شخصوں میں یعنی خدا اور انسان میں پایا جاتا ہے"۔ اور کہ "یہی شخصی رشتہ وہ بات ہے جس کے درست کئے جانے کی ضرورت ہے اور کہ جب انسان کا رشتہ خدا سے درست ہو جاتا ہے تو پھر انسان خدا کی گورنمنٹ کے ساتھ آپ ہی آپ درستی سے پیش آتے ہیں"۔ مگر ہمیں یہ خیال لازمی معلوم نہیں ہوتا۔ شاید اِس سے یہ فائدہ ہو تو ہو کہ بعض قیاسی قانونی اصطلاحیں جو علم تھیالوجی میں استعمال کیجاتی ہیں اس سے رُک جائیں۔ کیونکہ خدا کا قانون اور خدا کی شخصیت ایک ہی ہیں۔ خدا خود اخلاقی انتظام ہے اُس میں جیسا کہ ڈاکٹر ڈیل صاحب فرماتے ہیں "شریعت زندہ ہے" پس معافی کے معاملے میں خدا کے ساتھ "شخصی رشتہ"۔ رکھنے کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا تعلق خدا کی شریعت

سے نہیں ہے ۔ ہمارے نزدیک کوئی لازمی امر نہیں ہے ۔ ہم
پھر کہتے ہیں کہ خدا خود شریعت ہے ۔ اور چونکہ وہ شریعت ہے
اور ہم شریعت نہیں ہیں ۔ اس لیئے ہمارے معاف کرنے
اور اُس کے معاف کرنے میں کسی طرح کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا
ہمارے لیئے معافی کا یہ مطلب ہے کہ ہم اُن نقصانوں کو جو ہمپر
دوسروں کی جانب سے وارد ہوئے ہیں بھول جائیں لیکن
خدا کی معافی میں محض بھولنا ہی نہیں پایا جاتا ۔ اگر وہ ازلی
اخلاقی انتظام جو کہ اخلاقی دنیا کی بنیاد ہے گناہ اور اُس کے
نتیجہ کو آپس میں جکڑے ہے تو پھر کس طرح ہو سکتا ہے کہ
وہی جو خود وہ انتظام ہے اِن دونوں باتوں کو جدا جدا کرے
اور پھر بھی خدا بنا رہے ؟ پس انسان کے لیئے معاف کرنا اُسکے
فرائض میں سے ایک سادا سا فرض ہے ۔ مگر خدا کے لیئے
سب سے گہرے سوالوں میں سے ایک سوال ہے ؛

اب کیا اِس سوال کا حل کرنا ڈاکٹر چامرز صاحب کے قول
کے مطابق " ایسا امر نہیں ہے جو خدا کی شان کے شایاں ہے "
ہاں یہ سوال کوئی ایسا چھوٹا سا سوال نہیں ہے جس سے معاف
کرنے کے لیئے شخصی نارضامندی یا شخصی انتظام کی بو آتی ہے
نہیں یہ ایسا سوال نہیں ہے ۔ یہ سوال دنیا کے اخلاقی انتظام
کا سوال ہے ۔ اُس انتظام کا جو خدا کے وجود اور ہستی سے
متعلق ہے ۔ اور یہ سوال خدا کے لیئے کیا مطلب رکھتا ہے ؟
یہ وہ بات ہے جو ایک دم دو مختلف باتوں کو ظاہر کرتی ہے ۔

ایک طرف تو اُس سے یہ آشکارا ہوتا ہے کہ گناہ کی مزدوری موت ہے۔ اور دوسری جانب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم جو گنہگار ہیں ہمیشہ کی زندگی کے وارث ہیں۔ اِس سے اُن آدمیوں کا بچانا مراد ہے۔ جن پر دنیا کے اخلاقی انتظام نے فتوٰے لگایا ہے۔ اور ساتھ ہی اُس اخلاقی انتظام کو بھی جس نے اُنپر فتوٰے لگایا محفوظ رکھنا مطلوب ہے۔ یہ گویا خود ازلی اور ابدی طور پر راستباز ہونا اور ساتھ ہی ابدی طور پر ناراستوں کو راست ٹھہرانا ہے۔ یہ مطلب ہے اس سوال کا۔ لیکن جب کوئی آدمی کسی اور کو معاف کرتا ہے تو اُسکے سامنے یہ مشکل اور پیچیدہ باتیں نہیں آتی ہیں۔ لیکن اگر خدا ہمیں معاف کرنا چاہے تو یہ سب باتیں برپا ہونگی۔ پس یہ سوال خاص خدا کے لئے ہے۔ اور اُس کی شان کے شایاں ہے ؀

اب اِن سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ گناہوں کی معافی کا سوال صرف یہی نہیں ہے کہ "آیا خدا معاف کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟" بلکہ یہ بھی ہے کہ "وہ کس طرح معاف کرے؟" یعنی جو سوال خدا کے حصہ میں آتا ہے اور جو اُس کی شان کے شایاں ہے وہ معافی کے طریقہ سے وابستہ ہے۔ اب اِس بات پر کہ وہ طریقہ کہاں ملتا ہے کوئی شک نہیں لاسکتا۔ یعنی ہم اُسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس نے اپنی نسبت یہ کہا کہ "میں راہ ہوں" یعنی حقیقت المسیح کی طرف پھر راجع ہوتے ہیں۔ اس ساری بحث میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ہم ایک منٹ کے لئے بھی تاریخ سے اِدھر اُدھر نہ ہوں۔ عقلی دلائل کی پُرکار بہت کام آتی ہے۔ مگر وہ جلد بگڑ بھی جاتی ہے

لیکن حقیقی واقعات وہ بے نقص ستارے ہیں جن سے اُس مسافر کو جو صداقت کی تلاش میں ہوتا ہے راہ دریافت کرنی چاہیئے یسوع کے وہ واقعات جو اس سوال سے علاقہ رکھتے ہیں اور جنکو اُس نے خود جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں اس معاملہ سے مربوطہ کیا اُسکی موت کے واقعات ہیں - اور اُن سے پروفیسر ڈینی صاحب کی تشریح کے مطابق "وہ تجربہ مراد ہے جس میں سے خدا کا بیٹا پہلے گتسمنے میں گذرا اور جو پھر کلوری پر حادث ہوا - آؤ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوں ؛

اب اس کی طرف متوجہ ہونا گویا اُس بات کی طرف متوجہ ہونا ہے جو تمام تاریخ میں نہایت حیرت افزا ہے ہم اُس شخص کی طرف متوجہ ہولتے ہیں جسے ہم نے اپنے ایمان میں خدا کی جگہ دی اور جس کی ہرایک حرکت کو ہم نے عبودیت کی روح سے دیکھا اور جسے ہم نے بنی آدم میں نہ صرف سب سے پہلا گردانا بلکہ بے نظیر اور یکتا تصور کیا - اور پھر ہم اُسے اُس حالت میں جسے ایک بزرگ نے "آخری آزمایش" کہا ہے دیکھتے ہیں اور ہم اُسے بہ سبب آنیوالی موت کے خیال کے جانکنی کی حالت میں پاتے ہیں - اور ہم کہتے ہیں کہ اُس کے خون کا پسینہ اُس کی مختصر اور منتشر سی دعا - اُس کا بار بار مُنہ کے بل کرنا - اُس کا شدت کا غم اور رنج - اس کا پرلے درجہ کا ڈر اور خوف - اس کی بے بیان حیرانی اور پریشانی - اُس کی روح کا ہولناک طور پر مضطرب ہونا کیا مطلب رکھتا ہے ؟ اس میں شک نہیں کہ ہم اُن کمینے منکروں کو پسند نہیں کرتے جو اُس

تہذیب سے کام نہیں لیتے - جو ہر شہید اپنے دکھ کے وقت طلب کرتا اور طلب کرنے کا حق رکھتا ہے بلکہ برعکس اس کے طعنہ زنی سے اُس کی طرف اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں - اگر اور کوئی سبب نہ ہو تو تہذیب ہی کی خاطر اُسے ٹھٹھوں میں نہیں اُڑانا چاہئے - پر تو بھی یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ ہم کس طرح سچائی کی خاطر ایسے شخص کی عبادت کر سکتے ہیں؟ ہاں ہم پوچھ سکتے ہیں کہ کیا یسوع اسی حالت میں جیسی کہ اوپر رقم ہوئی ہے بے مثال اور یکتا یا کم از کم سب سے بڑھکر ہے؟ ہم اُس عجیب نظارے کو یاد کرتے ہیں جو ایتھنز کے قید خانہ میں ظاہر ہوا - جبکہ سقراط نے اپنی آخری آزمایش کو بڑے تحمل اور خوشی اور خوش مزاجی سے قبول کیا - ہم فیڈو کے آخری صفحے پڑھتے ہیں - اور وہ .. کیسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں - ہم پھر اُس شکل کی طرف جو جانکنی میں مبتلا ہے دیکھتے ہیں اور ہماری تعظیم میں جو ہم یسوع کے لیئے رکھتے ہیں بڑی جنبش پیدا ہوتی ہے - اور ہمارے دل اِس بات کو خواہ پسند نہ ہی کریں - اور اِس خیال کو روکنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں تاہم وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ اِس خیال کو جگہ دیں کہ یسوع کم از کم اِس ایک بات میں ہمارے لیئے کامل نمونہ اور تازگی بخش طاقت نہیں ہے - پر یہ خیال ہماری ساری عیسائیت کو تبدیل کرنے کے لیئے کافی ہے۔

اب ایک ہی بات ہے جو ہمیں اِس نتیجہ سے بچا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ تشبیہہ یا مقابلہ جس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا ہے نا ممکن ہو - اگر "وہ پیالہ" جو سقراط نے "بے تامل اور بڑی خوشی کے

ساتھ" قبول کیا۔ اور وہ پیالہ" جس سے یسوع نے اپنی جانکنی کی حالت میں چھوٹنا چاہا ایک ہی قسم کے پیالے تھے یعنی دونوں محض موت کے پیالے تھے تو یسوع مسیح کی موت خواہ زیادہ دُکھ اور شرم کی موت ہی کیوں نہ ہو" تاہم نتیجہ مذکورہ بالا ناگزیر ہے۔ بہت مناسب ہے کہ ہم اِن باتوں سے واقف ہوں۔ اگر یسوع کی موت محض موت ہی تھی تو ہم اُسے اُس کا صحیح نام پورے طور پر نہیں دیتے جبکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ الٰہی شخص تھا اور نہ اُسے اُس کی اصل جگہ دیتے ہیں جبکہ ہم اُسے اپنا کامل اور پورا نمونہ تصور کرتے ہیں۔ پر کیا اُسکی موت محض موت تھی؟ یسوع خود اس کی نسبت ہمیں کچھ اور ہی بتاتا ہے؟

ہم پھر اُس کی یہ بات یاد کرتے ہیں کہ اُس کی موت" گناہوں کی معافی کے لئے ہے" نیز ہم اُن باتوں کو یاد کرتے ہیں۔ جو ہم گناہوں کی مخلصی یا معافی کی بابت سوچتے رہے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ یہ لازمی ہے کہ معافی یعنی خدا کی معافی (کیونکہ حقیقی اور کامل طور پر وہی معاف کر سکتا ہے) کے مطلب میں یہ بات بھی شامل ہو کہ وہ تمام اخلاقی انتظام نظر انداز نہیں کیا گیا جس کے سبب سے گناہ اور گناہ کی سزا بقول افلاطون" آپس میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہاں یہ لازم ہے کہ معافی اس انتظام کو کسی طرح ابتری میں نہ ڈالے۔ اور نہ کوئی اور ایسا حل پیش کرے جو اِس انتظام کا مخالف ہو۔ بلکہ برعکس اِس کے اُس کی رعایت کرے اور جو کچھ کیا جائے وہ اُس کے حق کو تلف نہ کرے۔ اب دیکھئے کہ یسوع نے یہ کہا ہے کہ میری موت

"گناہوں کی معافی کے لئے ہے"۔ پس اس کی موت میں وہ حق رسی پائی جاتی ہے جو اُس اخلاقی انتظام کی معاون ہے جو گناہ اور اُس کے پھل کو جکڑے ہوئے ہے۔ پس اُس کی موت وہ بند تھا جس کی ماہیت کو ہم بہت ہی تھوڑا بلکہ مشکل سے محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم معاف کئے گئے ہیں) جس نے اُس دل کو جو خدا کی محبت کے بند کے سوائے اور کسی بند سے واقف نہ تھا زور سے جکڑا۔ اور اُس سر کو جو خدا کی یاد سوائے خوشی کے اور کسی طرح نہیں کیا کرتا تھا زور سے دبایا۔ آدمی اِن باتوں کو بڑی سادگی سے اپنی زبان سے نکال دیتا ہے۔ اور وہ الفاظ جن میں یہ باتیں ادا کی جاتی ہیں بالکل ٹھنڈے اور پھیکے سے ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ اُن حقیقتوں پر جو اِن الفاظ سے صادر ہوتی ہیں ٹھیک ٹھیک طور پر سوچتا ہے تو دل ورطۂ تحیر میں غرق ہو جاتا ہے۔ یعنی عجیب قسم کے چونکانے والے خیالات اُس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ یسوع کی جانکنی جب ہم اُس پر غور کرتے ہیں تو ہمیں خوف اور حیرت سے بھر دیتی ہے کیا یہ جانکنی اُس انسانی کمزوری کے سبب سے تھی جسے ہم تمسخر میں اُڑا نہیں سکتے مگر جسکی عابدانہ تعریف بھی نہیں کر سکتے؟ یا وہ اُس بے مثل بوجھ کے سبب سے واقع ہوئی جو انسانی گناہ اور گناہ پر فتوے لگانے والے اخلاقی انتظام کے باہم ملنے سے پیدا ہوئی یا یوں کہیں کہ اِن دونوں باتوں کے اُس دہشت افزا اور سچے اور ناگزیر میل کے سبب سے پیدا ہوئی جسے ایک الٰہی اور اخلاقی طور پر واجب اور کامل معافی کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی جگہ اور کسی نہ کسی طرح وقوع میں آنا تھا؛ کیا یہ میل صلیب پر واقع ہوا؟ اگر ایسا ہوا تو دیکھئے کہ کس طرح وہ تشبیہیں

اور مقابلے جو سقراط کے زہر والے پیالے اور یسوع کے اس پیالے میں قائم کئے جاتے ہیں کافور ہو جاتے ہیں اور بہ سبب شرم اور ہیبت کے سکوت اختیار کرتے ہیں ؏

ممکن ہے کہ یہ خیالات وحشیانہ اور بے ڈھنگے سے معلوم ہوں۔ مگر ہم کیا کریں یسوع خود انہیں پیش کرتا ہے۔ اور اسی طرح مسیحی عقل بھی جو اُس روح سے ہدایت پاتی ہے جس کی نسبت مسیح نے یہ کہا ہے کہ وہ مُجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دیگی؟ ان باتوں سے ڈر کر پیچھے نہیں ہٹتی۔ بلکہ یہ یقین رکھتی ہے کہ وہ برحق ہیں۔ اُسے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یسوع کا مرنا گویا گناہ کی ذمہ داری کو خدا کی شریعت کے سبب سے جو فتوے لگاتی ہے اپنے اوپر اُٹھالنے کے برابر ہے۔ اب مسیحی اس بات کا قائل صرف اسی لئے نہیں ہے کہ دوسرے پہلو کو اختیار کرنے سے اُس کی ساری مسیحیت پر عجیب قسم کا اثر پڑتا ہے۔ وہ اس کا قائل ایک اور سبب سے بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ یسوع کی موت (اور اس جگہ اس بات کا یاد رکھنا ضروری امر ہے کہ اس سے وہ تمام تجربہ مراد ہے جس میں سے یسوع گتسمنے سے لیکر آخر تک گذرا) میں اُس بات کو دیکھتا ہے جو اس کا حصہ تھی مگر اُس پر وارد نہیں ہوئی اور اُس خوشخبری کے مطابق جو یسوع کے وسیلے آئی آگے کو بھی اُس پر کبھی وارد نہ ہوگی۔ اور وہ دیکھ لیتا ہے کہ میرا کیا حال ہوتا اگر اپنے گناہ سر پر اُٹھائے ہوئے مجھے بغیر سکرمینٹ لئے اور مایوسانہ طور پر اور بغیر مسیح پائے خدا کی شریعت کے سامنے آنا پڑتا۔ بیشک گتسمنے باغ اور صلیب کے اوپر ایک طرح سے بعید الفہم اور خوفناک راز کا بادل چھایا ہوا ہے۔ پر

ایک بات اُس سارے نظارے میں بالکل صاف ہے اور یہ کہ اگر مسیح وہاں نہ ہوتا تو شاید میں وہاں ہوتا بلکہ یہ لازم امر تھا کہ میں وہاں ہوتا یہی سبب ہے کہ گو ہر زمانہ میں لوگوں نے طرح طرح کی تشریحیں اختیار کیں۔ تاہم مسیحیوں نے ایک ہی طرح کے تجربہ سے جو اُنکے اخلاقوں سے ہزارہا درجے گہرا ہے۔ ایکدل ہوکر یہ کہا ہے "وہ ہمارے گناہوں کے لئے گھائل ہوا۔" یا یہ کہ "وہ ہمارے لئے موا" یا یہ کہ "جس نے مجھے محبت کی اور میرے لئے اپنی جان دی۔" اِس قسم کے مقامات کا بڑھانا بہت فائدہ نہیں رکھتا۔ کیونکہ جس طرح یہ مطلب شروع میں چند الفاظ سے ادا کیا جاسکتا ہے اُسی طرح بہت سے الفاظ استعمال کرنے کے بعد ہوتا ہے اور جس طرح کوئی عالم اُس کو ادا کرسکتا ہے اُسی طرح ایک کم علم بھی ادا کرتا ہے کیونکہ جو لفظ سارے مطلب کو ادا کرتے ہیں وہ "ہمارے گناہوں" "ہمارے لئے" اور "میرے لئے" ہیں کیونکہ آپ یسوع کی موت کے عظیم معنوں کو ضمیر کے متکلم صیغوں کے بغیر ادا نہیں کرسکتے۔ اور جب آپ اِن صیغوں کو مذکورہ بالا صورت میں شخصی طور پر استعمال کرتے ہیں تو گویا آپ سب کچھ جو اس امر میں کہنے کے قابل ہے کہہ دیتے ہیں۔ اب تو آپ نے حقیقت المسیح کے آخری معنے بھی دریافت کرلئے ہیں ٭

ہاں اب ہمنے دیکھ لیا کہ حقیقت المسیح کا آخری مطلب یہ ہے کہ یسوع نے ہمارے لئے معافی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اور وہ اِس طرح کہ اُس نے اخلاقی اصول کو جس کے سبب سے گناہ اور گناہ کی سزا آپس میں جڑے ہوئے ہیں قائم رکھا۔ کیونکہ بدوں اُسکا لحاظ کرنے کے خدا کی معافی وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ پس وہ ہمیں

خدا کے ساتھ ملا دیتا ہے اُس خدا کے ساتھ جو کہ خود ہی وہ اخلاقی سلسلہ ہے
اِس بنا پر مذہب خدا کے اور ہمارے درمیان رفاقت اور دوستی کا رشتہ
بنکر شروع ہو سکتا اور جاری رہ سکتا ہے - آؤ ہم پھر اُن دو ستونوں
پر غور کریں جنپر یہ خیال مبنی ہے - اُن میں سے ایک اخلاقی اصول
اور دوسرا تاریخی واقعہ ہے - وہ اصول یہ ہے کہ معافی اخلاقی دنیا کے
سلسلے کو ابتر نہ کرے اور نہ کسی طرح کا کوئی ایسا حل پیش کرے جسکے
مطابق گناہ اور گناہ کی سزا کا دائمی تعلق ٹوٹ جائے اور وہ تاریخی واقعہ
یسوع کی موت ہے لیکن اُس معنی میں جو یسوع کے اپنے الفاظ نے
اور اُس کی زندگی اور سیرت اور شخصیت کی عام تاثیر نے اور مسیحیوں
کے عرفان نے اُس پر چسپاں کئے ہیں - اِن دو ستونوں پر وہ عظیم مسئلہ
جسے علم الٰہی کی اصطلاح میں کفارہ کہتے ہیں قائم ہے ؂

بہت لوگ یہاں آکر ٹھہر جاتے ہیں - کفارے کی حقیقت کو قبول تو
کر لیتے ہیں مگر اُس کا مطلب سمجھانے کا یا یوں کہیں کہ اُس کی تشریح کرنے
کا دعوٰے نہیں کرتے - وہ کولرج صاحب کے ساتھ متفق ہو کر صرف یہ
مانتے ہیں کہ کفارہ ایک حقیقی واقعہ ہے وہ اُس حقیقت کو جو اس واقعہ
کے بیان سے ٹپکتی ہے اور نیز اُن نتائج کو جو اس سے پیدا ہوتے ہیں
بیان کر کے خاموش ہو جاتے ہیں - یا بعض لوگ ٹیلر صاحب سے
متفق ہو کر ذرا زیادہ محفوظ الفاظ کو استعمال کر کے یوں کہتے ہیں کہ
اگر نوشتوں نے مسیح کے کفارہ کو ایک رازِ سربستہ کی طرح چھوڑ دیا ہے
(اور اس میں شک نہیں کہ اُنہوں نے ایسا ہی اُسے چھوڑا ہے) - تو
ہماری دانائی اس بات میں ہے کہ ہم شکر گذاری کے ساتھ اُن شرائط

کو پورا کریں جنکے پورا کرنے سے اُس کے فوائد ہمیں دستیاب ہوتے ہیں
اور اس بات پر بحث نہ کریں کہ یسوع نے کس طرح اِن فوائد کو کمایا۔
اب اگر اِن لفظوں کا یہ مطلب ہے کہ یسوع کے کام کے وسیلہ سے
جو معافی وجود میں آتی ہے ہم اُس کے اصولوں کو آخری اور مکمّل صورت
میں ادا نہیں کر سکتے تو ہم ان باتوں کو قبول کرتے ہیں۔ کیونکہ کفارہ کو
پورے پورے طور پر سمجھنا گویا اِن تین باتوں کو اُنکے باہمی رشتوں کے
متعلّق کماحقہٗ سمجھنے کے برابر ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ اوّل وہ بات جو
خدا میں سب سے بڑی بات ہے۔ اور وہ اُس کی محبّت ہے۔ دوسری
بات وہ ہے جو تمام عالم میں سب سے زور آور ہے اور وہ قانون ہے
اور تیسری وہ بات ہے جو انسان میں سب سے تاریک ہے اور
وہ گناہ ہے۔ واقعی یہ وہ باتیں ہیں جو ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔
پر اگر کولرج اور ٹیلر صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُن اخلاقی اور عقلی اصولوں
کو بھی جو اس عظیم حقیقت میں مخلوط ہیں سمجھنے کی امید نہیں رکھ سکتے
تو یہ بالکل دوسری بات ہے۔ اس حالت میں کفارہ کسی مناسب
معنے میں بھی مذہب کے لئے ایک حقیقت نہیں ٹھہر سکتا۔ کیونکہ
مذہبی صداقت اپنے اندر یہ وصف ضرور رکھتی ہے تاکہ ناطق مخلوقات
کی زندگی کے لئے ایک محرک اور ترغیب اور اپیل کا کام دے۔ پس
کفارے کی حقیقتیں ایسی حقیقتیں نہیں ہیں کہ خیال اُن تک پہنچ نہ سکے
لہذا کفارے کے متعلّق اس بات کا انکار کرنا گویا اُسے مذہب سے
الگ کرنا اور محض جبر مقابلہ کا ایک اصول بنانا ہے۔ اس میں شک
نہیں کہ یہ حقیقت ہمیشہ ہم سے آگے آگے بڑھتی اور بعید تک پہنچتی

جائیگی اور یہ ہمارے لئے اچھا بھی ہے - کیونکہ اِس کو دیکھکر یاد کرینگے کہ خدا کے خیالات "ہمارے سر کے پیمانہ سے بڑے ہیں" تاہم کفارے کی حقیقت محض ایک بھید ہی نہیں ہے - کیونکہ اِس کے اصول خواہ کیسے ہی وسیع کیوں نہ ہوں تاہم ایسے وسیع نہیں ہیں۔ کہ ہم اُنکو ذرا بھی نہ سمجھ سکیں - یہ اصول مسیحی عقل اور تجربہ کو کسی بھید کی گنگی تاریکی سے ملفوف نہیں کرتے بلکہ عقلی اور اخلاقی صداقت کے نور کو اُنپر چمکاتے ہیں ؂

شاید یہ مناسب ہوگا کہ جہاں ہم نے اتنا کچھ کہا ہے وہاں کچھ اور بھی کہیں تاکہ اِن اُصولوں کی شرح ہو جائے - چونکہ یہ لکچر علم الٰہی پر نہیں دئے گئے ہیں - لہٰذا ہمیں یہ بات ضروری معلوم نہیں ہوئی۔ کہ ہم مسیح کی حقیقت کے پہلے دو معنوں میں سے ایک کے تعلق میں روح القدس کے مسئلہ پر اور دوسرے کے متعلق کرسٹا لوجی (یعنی مسیح کی ذات اور شخصیت) پر بحث کریں - کیونکہ اِن دونوں باتوں کے متعلق مذہبی حقیقتیں اپنے معنے اور مرتبہ کو آپ ظاہر کر رہی ہیں لیکن کئی وجوہات کے سبب سے کفارے کا مضمون مختلف صورت رکھتا ہے اگر ہم اُس کے مطلب کے متعلق لاعلمی یا غلطی میں مبتلا ہوں تو وہ ہمارے لئے اور تو کیا مذہبی فائدہ بھی نہیں رکھیگا - پس جو کچھ ابتک رقم ہو چکا ہے اُسپر ذرا سا تتمہ ایزاد کرنا انسب معلوم ہوتا ہے جس میں اُن روحانی اُصولوں کا کچھ بیان ہو جو ہمارے گناہوں کی اُس معافی کی تہ میں پائے جاتے ہیں۔ جو یسوع مسیح کے کفارے کے وسیلے حاصل ہوتی ہے - واضح ہو کہ ہم یہاں صرف اُنکا ایک خلاصہ سا پیش کرینگے ؂

تتمہ۔ کفارے کے اصول

یسوع مسیح نے لوگوں کے گناہوں کے کفارے کا جو کام کیا وہ اُسکی زندگی کا کوئی نیا کام نہ تھا۔ کفارہ گویا انسان کی نجات کے کام کا جو ہمیشہ اُسے مدِ نظر تھا اپنی تلخ سی تلخ منزل تک پہنچ جانا تھا۔ پس اس امر کے متعلق ہمیں جس بات کی تلاش کرنی چاہیئے وہ نئے اصول نہیں ہیں وہ تو وہی اُبھرے ہوئے اُصول ہیں جو اُس کے کام کے دوسرے پہلوؤں میں نظر آتے ہیں جو کفارے کی طرح پُر راز نہیں ہیں۔ پس ہمارا کام یہ ہے کہ اُنہی اُصولوں کے نئے معانی اور نئے نئے فوائد کو دریافت کریں۔ لہذا ہم اس سوال سے شروع کرتے ہیں کہ نجات کے کام کے متعلق جو رشتہ مسیح بنی آدم سے رکھتا ہے اُس کا بڑا اُصول کیا ہے؟

اور یہ دریافت کرنا کہ وہ اُصول کیا ہے مشکل کام نہیں ہے۔ وہ مسیح کی حقیقت کے متعلق ہماری ساری تحقیقات میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے۔ آؤ ہم اُس حقیقت کے سب سے پہلے اور سادے مطلب پر پھر غور کریں۔ جب ہم مسیح کے مطلب پر اخلاقی زندگی اور سیرت کے متعلق غور کر رہے تھے تو ہمنے دیکھا تھا کہ وہ ہمارے لئے ایک اعلےٰ تعلیم اور بے نقص نمونہ سے بھی بڑھکر ہے۔ ہمنے دیکھا تھا کہ اُسنے ہمیں اپنی روح دی ہے جسکا یہ مطلب ہے کہ وہ خود (یسوع) ایک عجیب لیکن حقیقی معنی میں ہمارے اندر داخل ہوتا۔ اور ہمارے

خیالوں - جذبوں اور ارادوں کا یا دوسری صورت میں یوں کہیں کہ ہماری ہستی کا ایک حصہ بنجاتا ہے۔ "میں زندہ ہوں تو بھی میں نہیں بلکہ مسیح جو مجھ میں زندہ ہے"۔ وہ ہماری بہتر اور حقیقی ہستی کا ایک دوسرا نام بنجاتا ہے یہ بات اوّل سے آخر تک مسیحیت کا ایک خاصہ ہے - یہ ایک نشان ہے جو اُسے اوروں سے تمیز کرتا ہے - یہ وہ صفت ہے جس کی نظیر نہ ہندو مذہب میں اور نہ محمدی مذہب میں ملتی ہے - ہاں یہ وصف مسیح کے اُس رشتے کا ایک خاص عنصر ہے جو کہ وہ بنی آدم کے ساتھ اپنے نجات بخش کام کے متعلق رکھتا ہے - اور اُسکا اُصول صاف صاف طور پر ادا کیا جاسکتا ہے - وہ اُصول یگانگت کا اُصول ہے - یعنی اُس باطنی یکتائی کا جو مسیح اور انسان میں پائی جاتی ہے - اس خیال کو مسیح نے خود انگور کے درخت کی مثال دیکر یوں ظاہر کیا "میں سچے انگور کا درخت ہوں اور تم ڈالیاں ہو" اور پھر مقدس پولوس اسی یگانگت کے خیال کو "سر اور اعضا" کی مثال سے پیش کرتا ہے - یہ روحانی طور پر مسیح کے ساتھ ایک ہو جانا جو کہ نہ صرف تاریخ کے صفحوں میں ہمارے سامنے آتا ہے بلکہ باطن میں ہمارے ساتھ ملکر ایک ہوجاتا ہے بلکہ وہ "ہم" بنجاتا ہے - یعنی ایک عجیب صورت میں وہ انسان کی سب سے اعلےٰ ہستی سے مشابہت پیدا کرتا ہے - یہ روحانی یگانگت ہی اُس نجات بخش رشتہ کا اصول ہے جو کہ وہ بنی آدم کے ساتھ رکھتا ہے اور مسیحیت کا ذکر اُسکے بدون بالکل نہیں ہو سکتا - اور ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ اصول جو معافی کی جڑ ہے کوئی نیا خیال تو نہیں ہے - پھر اُسی پُرانے خیال کو نئے طور پر چسپاں کرنا ضرور ہے ؛

اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ معافی کا مسئلہ یہ ہے۔ کہ خدا دُنیا کے اخلاقی قانون کا منبع اور محافظ ہے۔ بلکہ وہ خود ہی وہ سلسلہ ہے۔ پر اِس اخلاقی انتظام کا یہ فرض ہے کہ گناہ پر فتوےٰ لگائے اور افلاطون کے قول کے مطابق گناہ اور گناہ کی پاداش کو باہم جکڑ رکھے۔ اب خدا ایسے لوگوں کو جو گنہگار ہیں کس طرح بخش سکتا ہے؟ مسیح اور بنی آدم میں جو یگانگت پائی جاتی ہے اُس کا اصول اس سوال کے جواب میں ایک اور سوال کو پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ " خدا کس طرح اُس پر جس میں مسیح ہے فتوےٰ لگا سکتا ہے"؟ اگر مسیح ہمارے ساتھ اِس طرح ایک ہو جائے کہ خدا ہمیں کبھی اس سے جُدا نہ دیکھے تو پھر کس طرح خدا ہم پر سزا کا حکم لگائیگا۔ کفارے کا اصول یہی ہے۔ یوں تو یہ مسیحیت کے ہر پہلو کا ایک لازمی اُصول ہے مگر معافی کے اِس پہلو کے متعلق کئی نئے اور نہایت گہرے معانی اور نتائج وابستہ ہیں ؛

اگر ہم دو مشہور بزرگوں کے کلام میں سے دو مقام اقتباس کریں۔ تو اُنسے وہ رُخ ظاہر ہو جائینگے۔ جدھر یہ مطالب اور نتائج دیکھ رہے ہیں۔ لوتھر نے گلتیوں کے خط پر جو تفسیر لکھی ہے اُس میں ایک مشہور مقام پایا جاتا ہے۔ جس میں وہ اِس اُصول کو صرف ایک ہی معنی میں بڑی صفائی اور زور کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا خدا مسیح سے یہ کہہ رہا ہے کہ " تو انکار کرنے والا پطرس اور اذیت دینے والا پولوس بلکہ ایک ایسا آدمی بنجا کہ جس اکیلے نے سب لوگوں کے گناہ کئے ہوں" اِس کے بعد لوتھر ایک اور نظارہ پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ جب خدا مسیح سے یہ کہہ چکتا ہے تو " شریعت آتی ہے اور کہتی ہے میں

اسے (یسوع کو) گنہگار پاتی ہوں۔ لہذا اس کو مرنا چاہیئے"۔ اِس اقتباس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس بات کے جاننے میں لوتھر کا اِن الفاظ سے کیا مطلب ہے کچھ دقت نظر نہیں آتی۔ لیکن ایک اور لائق مصنف اس مضمون پر لکھتے ہوئے اِس اُصول کو بالکل دوسری صورت میں چسپاں کرتا ہے۔ ایم کیمبل (M. Campbell. صاحب مرجنکا رسالہ کفارے کے متعلق ایک ایسی کتاب ہے کہ گو بعض بعض جگہ نکتہ چینی کے لائق ہے "تاہم اپنی قسم کی اُن کتابوں میں یکتا ہے جنکے مطالعہ کو دل چاہتا اور جنکا گہرا مطالعہ بہت فائدہ پہنچاتا ہے) لوتھر کا سا طرز اختیار کرکے کہتے ہیں "فرض کرو کہ تمام بنی آدم کا گناہ کسی ایک انسان نے کیا ہے۔ اور فرض کرو کہ یہ رُوح جو کل جُرم کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے گناہ سے نکلکر پاکیزگی میں آتی ہے۔ ایسا کہ خدا کی راستبازی سے کامل طور پر راستباز بن جاتی ہے" اور "بعینہ یہی حال مسیح خدا کے قدوس کا ہے جس نے تمام بنی آدم کے گناہوں کو اُٹھا لیا ہے اِس حال میں ڈاکٹر کیمبل کے خیال کے مطابق اِس قسم کی راستبازی تقاضائے شریعت کو پورا کرنے کا ایک سچا اور مناسب عمل ہے"۔ لوتھر کے خیال کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے ڈاکٹر کیمبل کے مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں کہ جب "شریعت آتی ہے" تو یسوع کو بصورت گنہگار دیکھکر اتنا یہ نہیں کہتی کہ وہ گنہگار رہے لہذا اُسے مرنا چاہیئے جتنا یہ دیکھکر کہ گنہگار تو اب مسیح بنگیا ہے یہ کہتی ہے کہ اب میرا تقاضا پورا ہو گیا ہے ؛

اب کفارے کے تمام تصورات اِن دو صورتوں میں سے کسی نہ کسی صورت

کے ضمن میں جگہ پا سکتے ہیں - ایک قسم کا تصوّر تو اُس یگانگت پر زور دیتا ہے جو مسیح ہمارے ساتھ رکھتا ہے - اور اسی طرح ہمارے گناہ پر بھی زور دیتا ہے "خدا نے اُسی کو جو گناہ سے واقف نہ تھا ہمارے لئے گناہ ٹھہرایا" مگر دوسرا تصوّر اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانیت مسیح سے یگانگت رکھتی ہے "ایک کی فرمانبرداری سے بہت راستباز ٹھہرے" اب دنیا میں اور کوئی بات ایسی غصہ دلانے والی نہیں ہے جیسی یہ کہ گریز کا نامناسب طریقہ اختیار کیا جائے - ہماری رائے میں یہ نامناسب طریقہ ہے کہ ہم اِن خیالوں کو ایک دوسرے کے برخلاف کھڑا کریں یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں - دونوں خیالوں کو تسلیم کرنا چاہئے - دونوں راہوں پر چلنا چاہئے - اور اس کی صاف وجہ یہ ہے کہ اصول زیر بحث ایک ایسی یگانگت یا یکتائی ہے جو گنہگار اور مسیح میں پائی جاتی ہے - پس یہ میل چونکہ میل ہے دو طرح کے پہلو رکھتا ہے جو ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہیں اور جن سے دو قسم کے نتائج وابستہ ہیں - اگر مسیح اور اُس کے لوگ ایک ہیں تو یہ رشتہ مسیح کی ماہیت کے سبب سے ہمارے حق میں ایک خاص قسم کے مطالب رکھتا ہے اور نیز ہماری ماہیت اور حالت کے سبب سے مسیح کے حق میں چند مطالب رکھتا ہے - لہذا جس طرح ایک نتیجہ اس میل سے منتج ہوتا ہے اُسی طرح دوسرا بھی ہوتا ہے - جس طرح ہمیں اُن خیالات کی طرف دیکھنا چاہئے جو کہ جرمن ڈاکٹر (لوتھر) نے پیش کئے ہیں - اسی طرح اُن خیالات کی طرف بھی دیکھنا چاہئے جو سکاچ ڈاکٹر (کیمبل) نے پیش کئے ہیں - پس کفارہ اس لئے کہ اُسکا اُصول میل یا یگانگت ہے

دو پہلو رکھتا ہے۔ پس صرف ایک ہی پہلو کو اختیار کر کے ہم اس بڑے راز سے کماینبغی واقف نہیں ہو سکتے ؛

واضح ہو کہ اس مبل کے جس پہلو پر لونفر نے مرقومۂ بالا اقتباس میں بہت زور دیا ہے۔ وہی وہ پہلو ہے جو بہتوں کے نزدیک نہایت نامرغوب ہے۔ پر ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسیح کا آدمی بننا اُس جگہ کے ساتھ بھی جو اُس نے اختیار کی کچھ رشتہ رکھتا تھا۔ کیونکہ انسان اُس وقت ایک خاص جگہ کھڑا تھا۔ اور وہ جگہ یہ تھی کہ اخلاقی انتظام کا فتولے جو گناہ اور گناہ کی سزا کو باہم ربط دیتا ہے اُسپر لگا ہوا تھا۔ اب اگر مسیح ایسا انسان بنا کہ اس کا اس بات سے کچھ بھی تعلق نہ تھا۔ تو اُس نے اس بات کو چھوڑ دیا جس کے متعلق آدمی اُس کی مدد کا محتاج تھا۔ لیکن کہیں بھی یہ اشارہ نہیں پایا جاتا کہ مسیح کا اس بات سے کچھ تعلق نہ تھا اُس نے آدمی کو بچانے کا ذمہ لیا۔ اور اِس کام کی انجام دہی کے لئے وہ انسان بنا اور ایسی حالت کے ماتحت آیا جس سے نجات کی ضرورت پیدا ہوئی تھی۔ دوسری صورت میں یہ کہیں کہ وہ فتولے کی حالت میں انسان بنا۔ اور اُس نے اِس حالت کے اصل اندازے کو نہ کبھی کلام سے اور نہ کبھی فعل سے ہلکا سمجھا یا گھٹایا۔ بلکہ برعکس اس کے اُس نے اُسی حالت کو قبول کیا کیونکہ وہ اُس انسانیت کی حالت تھی جسکی صورت کو اُس نے اختیار کیا تھا۔ اور پھر جیسا اُس حالت کے ساتھ سلوک کرنا چاہیئے تھا کیا۔ ہاں اُس نے ایک عظیم اور سنجیدہ اور حقیقی صورت میں اُس کے ساتھ سلوک کیا۔ اُس نے اُس سے گریز نہیں کیا اور نہ اُسے پامال کیا بلکہ جو کچھ اُس کے لئے درست تھا سو ہی کیا۔ اور اس طرح کیا۔

کہ جو کچھ اِس قسم کی حالت کہہ سکتی تھی سو اُس نے سُنا۔ اب ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کبھی ہم اِس بات کو پیش کریں تو خبردار رہیں کہ اِس سے زیادہ کچھ نہ کہیں۔ ایسے ایسے خیالات کہ کِس طرح یہ تعلق اپنا کام کرتا ہے۔ یا یسوع کے لیئے اِس کا کیا مطلب تھا کبھی بے فکری سے ادا نہیں کرنے چاہئیں۔ ایسے ایسے فقرے کہ "خدا نے مسیح کو سزا دی" یا "خدا اُس سے ناراض تھا" بالکل ناموزوں ہیں۔ اور اِس دوسرے جملہ کی نسبت تو کالون بھی مانتا ہے کہ یہ بات نا ممکن ہے۔ لیکن جن باتوں کا صاف صاف بیان کرنا چاہیئے وہ دو ہیں۔ اوّل یہ کہ اخلاقی قانون ہیں جس نے گناہ اور گناہ کی سزا کو جکڑ رکھا ہے کسی طرح کی ابتری پیدا نہیں ہوئی بلکہ وہ کامل طور پر اور حقیقی طور پر پیدا ہوا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اِس قانون کی کامل اور حقیقی تکمیل مسیح کے کفارے میں ہوئی۔ یہ قانون ہم میں پورا نہیں ہوا اور مسیح کی خوشخبری کا یہ اعلےٰ حصہ ہے کہ ہم میں کبھی پورا نہیں ہوگا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منسوخ ہوگیا ہے۔ نہیں۔ اُس کو اُس کا حق مِلگیا ہے۔ اگر آپ پوچھیں کہاں؟ تو اس کا جواب اِس حقیقت میں مِلتا ہے کہ جب مسیح انسان بنا تو اُس نے وہ حالت اختیار کی جس میں انسان کھڑا تھا اور ساتھ ہی اُس کے نتیجوں کو بھی قبول کیا۔ اور ہمارے عوض میں انکو ایسے طور پر پورا کر دیا کہ اب اُنکا تقاضا باقی نہیں رہا۔ اب یہ بات خواہ کیسی ہی مشکل یا راز میں ملفوف کیوں نہ ہو تاہم بھی اکیلی اُس لازمی اُصول کو قائم رکھتی ہے جس کے مطابق خدا کسی طرح کی معافی بخش سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ اخلاقی دنیا کے اخلاقی قانون کو کسی طرح کی زک نہ پہنچے۔ اب چاہیئے کہ ہم اُس مشابہت کی حقیقت کو پکڑے رہیں جو مسیح

اجو کہ گنہگاروں میں شمار کیا گیا تاکہ اُنکے عوض میں جواب دے سکے) ہمارے ساتھ رکھتا ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ وہ جیسا اور رشتوں میں ویسا ہی اِس رشتہ میں بھی بہت بڑھکر ہے اور ہمارے بیان سے کہیں بڑی باتوں کو انجام دیتا ہے ۔

یہ بات اُس یگانگت کا ایک پہلو ہے جو ہم میں اور مسیح میں پائی جاتی ہے اور جو معافی کا اُصول ہے۔ یہ ساری باتیں بنیادی تو ہیں مگر اختتامی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ کفارہ کا فقط آدھا حصّہ ہیں۔ پس اس وقت کفارے کے دوسرے پہلو کی ضرورت بھی سامنے آتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم پورے پورے طور پہ یہ مان لیں کہ مسیح کی حقیقت اُس کو اُس اخلاقی قانون کے روبرو جوابدہ بناتی ہے جو گناہ اور گناہ کے فتوے کو باہم مربوط کرتا ہے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا میرے ساتھ کیا تعلق ہے یا یوں کہیں کہ مجھپر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ میں تو مسیح نہیں ہوں ممکن ہے کہ اُس نے اخلاقی قانون کو پورا کیا۔ پر اُس کا پورا کرنا میرا پورا کرنا نہیں ہو سکتا۔ اگر میں وہ (مسیح) ہوتا تو پھر کسی طرح کی دقّت پیدا نہ ہوتی پر میں تو وہ نہیں ہوں۔ میں اب بھی گنہگار رہوں۔ لہذا اب بھی جواب وہ ہوں۔ یہاں پہنچکر مسیحی مذہب کا اصول یعنی مسیح اور انسان کی یگانگت کا اصول پھر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اپنے تکمیل بخش مطلب کے وسیلے معافی کی خوشخبری کو پورا کرتا ہے ۔

وہ یہ کہتا ہوا آتا ہے۔ دیکھو مسیح جو راستباز ہے موجود ہے اُس نے اُس اخلاقی قانون کے تقاضے کو پورا کر دیا ہے جو کہ گناہ اور گناہ کی سزا کو باہم جکڑتے ہے۔ اور اب وہ تمہاری ہستی کا اعلےٰ حصّہ

بتنا چاہتا ہے۔ جس طرح اُس نے اپنے آپ کو اُس درجہ تک کہ جس درجہ تک انسان کا تعلق خدا کی شریعت کے ساتھ ہے انسان کا ہمشکل بنایا اُسی طرح وہ اب ہر ایک انسان کے دل اور مرضی کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اُسے اپنے ساتھ ایک شخصی یگانگت میں لے لے۔ یہی معافی کی خوشخبری کی دعوت ہے۔ یعنی یہ صرف کسی ایسے واقعہ یا مسئلہ کو کہ مسیح ہمارے لئے موا ماننا ہی نہیں ہے۔ بلکہ اُس شخص کو جس نے گناہ کی مشکل کو حل کیا قبول کرنا اور اُس کے ساتھ خیال میں اور دل میں اور مرضی میں ایک ہو جاتا ہے۔ اب اگر یہ سچ ہو تو کیا ایک سچے اور روحانی معنی میں وہ کام جو اُس نے کیا آپ کا نہیں ہے؟ بشرطیکہ آپ ایک حقیقی روحانی معنوں میں وہ بنگئے ہیں؟ "پس اب جو مسیح یسوع میں ہیں اُن پر سزا کا حکم نہیں ہے" کیونکہ وہ جواب جو اُس شریعت کو جس نے گناہ اور گناہ کے فتوے کو باہم جکڑ رکھا تھا ملا وہ اُن کا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ باطنی حقیقت میں جواب دینے والے (مسیح) کے ساتھ ایک ہو گئے ہیں۔

اس طرح وہ میل جو ہم مسیح کے ساتھ رکھتے ہیں یعنی ہماری عقل اور دل اور مرضی اور زندگی کا میل اُس کام کو جو اُس نے ہماری گری ہوئی حالت کے ساتھ ہمشکل ہو کر انجام دیا کامل کر دیتا ہے اور انجیلی معافی اُس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ یہ انجیل کیسی اخلاقی انجیل ہے۔ معافی کی وہ جھوٹی خوشخبری جو صرف شور مچاتی رہتی ہے جب تک کہ ہم اُسے برائے نام مان نہیں لیتے اس الزام میں مبتلا ہے کہ وہ معافی کے لینے کوئی مناسب اور ذاتی اخلاقی فوائد

نہیں، لکھتی ہے۔ پراٹسٹنٹ ملت میں اکثر گناہوں کی معافی ایک بات
اور مسیحی مورلیٹی (اخلاق) دوسری بات سمجھی جاتی ہے۔ اور یہ خیال
کیا جاتا ہے کہ اخلاقی زندگی گناہوں کی معافی کے بعد بسبب شکرگذاری
کے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ کہنا اس سوال کو نہایت ناقص اور غلط
طور پر بیان کرنا ہے۔ صحیح بات یہ ہے۔ معافی نہ صرف مسیح کے وسیلے
سے ملتی ہے بلکہ اُس میں ملتی ہے۔ انجیل میں محض معافی کوئی چیز نہیں
ہے۔ انجیل میں کوئی بات ایسی نہیں ہے، جو مسیح سے الگ ہو۔ آپ
معاف کرنے والے کے بغیر یا اُس سے الگ معافی نہیں پا سکتے۔
جب تک آپ اُسے اپنی عقل اور دل اور زندگی کے ساتھ یگانگت پیدا
نہ کرنے دینگے تب تک یہ برکت آپکو نہیں ملیگی۔ فقط اسی یگانگت کے
وسیلے سے وہ جو اُس نے کیا ہے آپ کا بنے گا۔ لیکن آپ مسیح کو
اپنی عقل اور دل اور زندگی کے ساتھ رشتہ پیدا کرنے نہیں دیتے۔
پس مورلیٹی معافی کا ایک تمتہ سا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہمارے پاس
مسیح کا ایک حصہ بنکر آتی ہے جسکا قبول کرنا ہمپر واجب ہے۔ اور
جس کی نسبت ہم کسی طرح چون وچرا نہیں کر سکتے۔ جس طرح معافی
مسیح کا ایسا ہے جسے ہم اُس سے جدا نہیں کر سکتے۔ اُسی طرح
مورلیٹی اُس کا ایک حصہ ہے۔ آپ یہ برکت (معافی) جسے ہمنے
مسیح کی حقیقت کا آخری مطلب کہا ہے نہیں پا سکتے تا وقتیکہ آپ
اُس حقیقت کا پہلا مطلب (سیرت) حاصل نہ کریں۔ یعنی جب تک
آپ یہ نہ جانیں کہ مسیح کا مطلب آپ کے لئے نئی زندگی ہے تب تک
آپ معافی نہیں پا سکتے۔ مسیح الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہے۔

مگر ہمیں اس کے ساتھ کچھ اور بھی کہنا ہے۔ ہم یہ دکھا چکے ہیں کہ ہم معافی کو اُس اخلاقی نمونہ سے جو ہمارے سامنے آتا ہے جدا نہیں کر سکتے۔ اور کہ جب ہم باطنی طور پہ شریعت کے پورا کرنے والے کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں تو فقط اُس وقت اُس کا وہ کام جو اُس نے شریعت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لئے کیا ہے ہمارا بنتا ہے۔ ہمارا اخلاقی نمونہ کی پیروی کرنا اور ہمارا یسوع کے ساتھ عقل اور دل اور زندگی میں ایک ہو جانا ابھی شروع ہی ہوا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ ہمیں یہ خیال گذرے کہ ہماری معافی بھی ابھی یقینی طور پر وجود میں نہیں آئی بلکہ طفولیت کے عالم میں ہے یا یوں کہیں کہ آزمائش کی حالت میں ہے۔ پر یہ خیال انجیل میں نہیں پایا جاتا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ جب ہم سچے طور پر اور صدق دلی سے مسیح کے ساتھ میل پیدا کرینگے خواہ وہ میل کیسا ہی ناکامل کیوں نہ ہو بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ناکامل ہوگا تو بھی اُس وقت وہ کام جو مسیح نے شریعت کے فتوے کو دور کرنے کے لئے کیا ہے ہمارا بنجائیگا۔ اور ہم یاد رکھیں کہ اُسکا وہ کام پورا اور کامل ہے۔ جب ہم اُس کے ساتھ میل کرتے ہیں تو ہمیں وہ جگہ ملتی ہے جسپر ہم کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اُس نے ہمیں شریعت کی لعنت سے چھڑایا ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر تمام انجیلی مسیحیت میں سے اُس پختہ یقین کی صدا آتی ہے جسے کوئی چیز تباہ نہیں کر سکتی۔ یہ اُس مرجھائی ہوئی امید کی جھلک نہیں ہے کہ آخرکار ہمیں معافی ملجائیگی یہ وہ یقین ہے جو محکم اور مضبوط اور پایدار ہے۔ اور اس میل میں جیسا ہمنے پہلے کہا ہمارے لئے ایک پاک زندگی کے شروع کرنے اور

اُس میں بڑھنے کی بلاہٹ بھی پائی جاتی ہے۔ اور جب مسیحی اس کام سے واقف ہو کر جو اُس کے خداوند نے اُس کے دشمنوں کے برخلاف کیا ہے زندگی کی جنگ میں مصروف ہوتا ہے اور اس خیال سے تحریک پاکر کہ میری مخلصی پورے طور پر وجود میں آچکی ہے میدان جنگ میں اُترتا ہے تو یہ بڑی بات ہوتی ہے ؛

اِن چند سطور کو باوجود نامکمل ہونے کے یسوع مسیح کے کفارے کے اصول کا کافی بیان سمجھنا چاہئے۔ واضح ہو کہ اِس مسئلے کی شرح کوئی بیان بھی خواہ وہ کیسا ہی مطول کیوں نہ ہو کامل طور پر نہیں کرسکتا ہے اور نہ اُن مشکلات کو جو اِس سے وابستہ ہیں حل کرسکتا ہے۔ یہ واقعہ بے نظیر ہے لہذا ہم اُس کو عام اصولوں کے ماتحت نہیں لاسکتے اور اُس کے بے نظیر ہونے کا سبب یہ ہے کہ اُس کی پہلی شرط جو ہے وہ بےمثل اور بے نظیر ہے۔ اور وہ مسیح اور اُسکے بندوں کی یکتائی ہے۔ وہ انسانی تجربہ میں بالکل بے نظیر ہے لہذا وہ دوستی یا نسلی یگانگت یا کسی اور ایسے ہی رشتہ میں عام طور پر داخل نہیں کیجاسکتی۔ ہم اور کسی کی نسبت وہ الفاظ استعمال نہیں کرسکتے جو یسوع کی نسبت کرسکتے ہیں جو ایک بزرگ کے قول کے مطابق ہماری ایسی زندگی ہے جو ہم سے جدا نہیں ہوسکتی" ہم کسی اور پیشوا یا اُستاد کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس طرح مسیح اور مسیحی (بقول ٹامس اقوائے نس) ایک عجیب اور پُر راز طور پر ایک شخص بنجاتے ہیں۔ اُسی طرح وہ اُستاد اور اُس کے پیرو بھی ایک ہوجاتے ہیں۔ اب یہ اصول اس ساری بات کی جڑ ہے اور چونکہ یہ خود ایک

بے مثال اُصول ہے ۔ اس لئے کفارہ بھی کسی ایسی عام اور کامل شرح کی قید میں نہیں آسکتا ۔ اب اگر یہ اصول ہمیشہ زیر نظر رہے تو اُن مشکلات اور اعتراضات میں سے جو اس مضمون کے متعلق برپا ہوتے ہیں بہت سے دور ہو جائینگے ۔ سب سے بڑا اعتراض جو اس بات پر کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس میں بے انصافی پائی جاتی ہے ۔ یعنی یہ بے انصافی کی بات ہے کہ ایک شخص اس طرح دوسرے کے گناہوں کو اُٹھائے ۔ پر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہم "ایک" اور "دوسرے" کے الفاظ اس مضمون کے متعلق استعمال کر سکتے ہیں ؟ یہاں تو "دوسرے" اور "غیر" کو جگہ ہی نہ رہی ۔ کیونکہ ایک پُرانے سکاٹلنڈ کے عقائدنامہ کے مطابق "مسیح اپنے خاص بندوں سے الگ نہیں ہے" اگر آپ چاہیں تو اسے بھید کہیں اور ہم اُس جگہ کو جہاں خدا انسان کو چھوتا ہے الفاظ میں ادا نہیں کر سکتے ۔ لیکن یہ بھید ایک حقیقت ہے اور اسی حقیقت میں اُس بے محل اور بے موقعہ الزام کا جو کفارے پر لگایا جاتا ہے جواب موجود ہے اکثر اوقات ایسے اعتراضات اُن لوگوں کی "نظیروں اور مثالوں" سے پیدا ہوتے ہیں جو نہ بائبل سے بہت واقف ہوتے ہیں اور نہ عقل سلیم سے بہرہ ور ۔ کفارے کی کوئی نظیر نہیں ہے ۔ صلیب اپنا مفسر آپ ہے ۔ اگر یہ سچ ہو اور اُس کی سچائی میں کسی طرح کا شک نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ اس کا مرکزی اُصول یعنی مسیح اور مسیحی کی یگانگت بے نظیر ہے ۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ اگر یہ بات کہ کفارے کی کوئی نظیر نہیں ہے سچ ہو تو پھر کفارہ کی صداقت اکمل صورت میں عالمان علم الٰہی کی ابحاث میں نظر نہیں آئیگی بلکہ اُس کتب میں کھائی

جاتی۔ جہاں روح خدا کی رفاقت میں ترقی کرتی ہے۔ پولوس اسکا تذکرہ اپنی دعاؤں میں بہت کرتا ہے۔ جب انسان خدا کے سامنے اپنی اخلاقی ناداری کا اقرار کرتا ہے اور اُسے پہچان لیتا ہے۔ تب اپنی ضرورت کو محسوس کر کے اس بات کو پہچانتا ہے کہ کس طرح اُس قدوس اور بے بدل نے مجھ سے ایسا پیار کیا کہ میرے فتوے کے ساتھ بھی مشابہت پیدا کی اور میرے عوض میں اُسے پورا کیا۔ اس خوشخبری کو ٹھٹھوں میں اُڑانا اُس شخص کا شیوہ ہے جس نے اپنے زخم کو کبھی محسوس نہیں کیا پر بیچارے گنہگار کا یہی ایک مذہب ہے۔

ہم اب اُس منزل تک پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں ٹھہرنا اور اُن عملی نتائج کو جمع کرنا چاہیئے جو ہماری تحقیق میں ہمارے سامنے آئے۔ پہلے ہمنے مسیحی مذہب کی بنیادی حقیقت پر غور کیا تھا اور ہمنے دیکھا تھا کہ وہ فلسفہ میں یا کسی اخلاقی سلسلہ میں پائی نہیں جاتی۔ بلکہ یسوع مسیح میں موجود ہے۔ اور پھر ہمنے اس بات پر غور کیا تھا کہ اِس زمانہ میں ہمارا مذہب اسی حقیقت پر کس درجہ تک قائم ہوسکتا ہے اور ہم نے دیکھا کہ مسیح نہ صرف تاریخ ہی کی ایک حقیقت ہے بلکہ روحانی زندگی اور تجربہ کی بھی حقیقت ہے۔ یعنی وہ ایسی حقیقت ہے جو مذہب کے احاطہ سے باہر نہیں۔ یہ دیکھکر ہم ذرا اور آگے بڑھ گئے تھے تاکہ دریافت کریں کہ اِس حقیقت میں مذہب کیلئے کونسے مطالب پائے جاتے ہیں۔ اور ہمنے معلوم کیا کہ اس میں سیرت اور ایمان اور ضمیر کے لئے گہری قسم کے مطالب پائے جاتے ہیں یعنی اُس میں ایک اخلاقی زندگی اور زندہ خدا کا سچا مکاشفہ اور یقینی معافی کی خوشخبری پائی جاتی ہے۔ یہ سب باتیں مذہب ہیں اور یہ مذہب مسیحیت ہے۔ ہم مسیحیت کی کوئی اور تعریف نہیں کرسکتے۔

سوائے اسکے کہ ہم یہ کہیں کہ مسیحیت مسیح کی حقیقت کا مطلب ہے۔ جس طرح مسیح کی حقیقت میں مسیحی مذہب کا اصل مصالح موجود ہے اسی طرح اُس مصالح کا لب لباب مسیحی مذہب ہے۔ یعنی مسیح کے معنے یا مطلب مسیحیت ہے ؛

اب ہم یہ نہ سمجھیں کہ جب ہم یہ باتیں دریافت کر چکے تو ہم سب کچھ دریافت کر چکے۔ ہمنے ابھی سب سے بڑی بات پر غور نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جو سب سے بڑی بات ہے وہ مسیحی مذہب کا سمجھنا نہیں بلکہ مسیحی بننا ہے۔ چاہیئے کہ نور زندگی بنجائے۔ ڈاکٹر چامرز صاحب جو ہر صداقت کے اخلاقی پہلو کے سمجھنے میں بڑے اُستاد گذرے ہیں فرماتے ہیں کہ مسیحی مذہب کے متعلق ہمارا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہم اُسپر عمل کرنے لگیں۔ ہمنے اس مذہب کا خاکہ کھینچ دیا ہے لیکن ہمیں ابھی اسے چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ ہمیں اب اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ ہم اس کیساتھ اب کیا کریں۔ یہ تو ہم دریافت کر چکے کہ مسیحیت کیا ہے۔ اب ہم یہ پوچھیں کہ مسیحی ہونا کیا ہے ؟

اس سوال کا جواب بہت سادا اور صاف ہونا چاہیئے کیونکہ مسیحی ہونا یقیناً ایک ایسی بات ہے جس کا سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب ہم اس کا جواب دیں تو کامل مسیحیت کو پورے پورے اور مناسب صورپر مد نظر رکھکر دیں نہ کہ اُس کے کسی ایک ٹکڑے کو زیر نظر رکھکر اب ہم اِس بات کو مد نظر رکھکر کہ مسیحیت کیا ہے۔ اِن دونوں باتوں کے متعلق خبرداری سے غور کرینگے مسیحیت مسیح کی حقیقت کے مطلب کا نام ہے۔ پس ہم مسیحی اُسے کہینگے جو اس مطلب کی پیروی

کرے۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ ہم مسیحی اُسے کہینگے جو اس مطلب کا اقرار کرے۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ مسیحی وہ ہے جو اس کی پیروی کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقرار کرنا اور اسی قسم کے اور الفاظ اور محاورات بیشتر عقیدوں کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر مسیح جیسا ہم دیکھ چکے ہیں وہ مطالب رکھتا ہے جو نہ صرف عقلی طاقتوں سے واسطہ رکھتے ہیں بلکہ ہماری زندگی اور سیرت سے بھی علاقہ رکھتے ہیں بلکہ یوں کہنا بیجانہ ہوگا کہ زندگی اور سیرت سے اُنکا تعلق زیادہ تر ہے۔ مگر یہ کہنا کہ ہم مسیح کی حقیقت کے مطلب کی پیروی کریں۔ ایک اور سوال برپا کرتا ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ وہ گہرے مطالب جو مسیح کی حقیقت سے صادر ہوتے ہیں اور جنکا بیان تم کرتے رہے ہو ایسے مطالب ہیں کہ کئی لوگوں کے لئے بہت سی عقلی مشکلات سے گھرے ہوئے ہیں۔ اب کیا وہی شخص مسیحی ہو سکتا ہے جو ان سب کو ماننا اور قبول کرتا ہے؟ تھوڑی دیر غور کرنے سے یہ دقت رفع ہو جائیگی۔ کیا ہم نے اخلاقی زندگی اور سیرت کے متعلق مسیح میں ایسے مطالب نہیں پائے جو محض چند ایک کے لئے نہیں بلکہ ہم سب کے لئے عملی مشکلات سے گھرے ہوئے ہیں؟ اب اگر بعض کے لئے مسیح کے اُس عقلی مطلب کو جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خدائے مجسم ہے قبول کرنا مشکل ہے تو اسیطرح ہم سب کے لئے مسیح کے اُس اخلاقی مطلب کو تسلیم کرنا مشکل ہے جو سیرت کے ساتھ وابستہ ہے اور بیبں پاکیزگی اور محبت کی تلقین کرتا ہے۔ پس ہمارا مسیح کے مطلب کی پیروی کرنا ایک طرح کا اعلےٰ نمونہ سامنے رکھنا ہے وہ جو کامل مسیحی ہے وہ ضرور مسیح کی حقیقت کے اُس مطلب کو جو عقل اور

زندگی کے لیئے ہے تسلیم کریگا لیکن کامل مسیحی کہیں ملتا بھی ہے؟ مقدس پولوس تو اپنی نسبت یہ کہتا ہے کہ "میرا گمان نہیں کہ میں پکڑ چکا ہوں" اسی طرح لوتھر اپنی نسبت کہتا ہے کہ میں "قریب قریب عیسائی ہوں" پس مسیح کے مطلب کو تسلیم کرنا ایک حقیقی فعل ہوتا ہے گو کامل فعل نہیں ہوتا۔ اس موقعہ پر ہمیں ایک میلان کا جو نہایت پُر زور مگر بالکل نامناسب ہوتا ہے مقابلہ کرنا چاہیئے بلکہ اُس سے نفرت کرنی چاہیئے وہ میلان یہ ہے کہ ہماری اخلاقی اور عقلی پیروی کے ساتھ جُدا جُدا اصولوں کی بنا پر سلوک کیا جائے اور کہ خصوصًا عقلی اطاعت کے متعلق اُس منزل پر نشان لگایا جائے جس پر پہنچنا مسیحی کہلانے کے لیئے ضروری امر سمجھا جائے۔ ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ہر ایک آدمی کو خوشی سے مسیحی کہتے ہیں خواہ وہ مسیح کے اُن مطالب کی اطاعت جو زندگی سے علاقہ رکھتے ہیں کیسی ہی کمزوری سے کیوں نہ کرے پر اگر وہ اُن مطالب کی جو عقیدوں سے وابستہ ہیں عقلی پیروی کافی طور پر نہ کرے تو وہ اُسے کبھی مسیحی نہیں کہینگے۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ لازم یہ ہے کہ مسیح کے مطالب کی اطاعت کا جو اندازہ آدمی کو مسیحی بنانے کے لیئے درکار ہے خواہ اُس کا تعلق عقیدے سے ہو خواہ چال چلن سے ہو اُسکا وزن ایک ہی طور پر کیا جائے۔ اور اگر پوچھا جائے کہ اُسکا وزن کس طرح ہو سکتا ہے تو اس سوال کا جواب صاف ہے۔ ہر ایک انسان کی عقلی اور اخلاقی ساخت اور اُسکے حالات ایسے خاص خاص اور بوقلمون ہوتے ہیں کہ کوئی شخص اس معاملے کے کسی پہلو کے متعلق بھی دوسرے کے لیئے فیصلہ نہیں

کرسکتا ہے - اور نہ یہ فیصلہ سب کے لئے یکدم ہو سکتا ہے - پس ہر شخص کی ذمہ واری کا فیصلہ خواہ وہ اخلاقی ہو خواہ عقلی ہو صرف ضمیر کے احاطہ کے اندر ہو سکتا ہے یا یوں کہیں کہ یہ فیصلہ وہی کرسکتا ہے جو ضمیر کا جانچنے والا ہے - خداوند اُنہیں جو اُسکے ہیں جانتا ہے ٭

اب ہم اِن باتوں سے ہٹکر مسیحی کی تعریف کی طرف آسکتے ہیں - اگر یہ کہا جائے کہ تم لفظوں میں بیان کرو کہ مسیحی کسے کہتے ہیں - تو ہم اس کا جواب کچھ کچھ مندرجہ ذیل الفاظ میں دینگے - مسیحی وہ ہے جو مسیح کے اُن تمام مطالب کی اطاعت کرتا ہے جو خدا کی روح کے وسیلے اُس کی ضمیر پر عقلی اور اخلاقی معاملات کے متعلق ظاہر ہوتے ہیں - اب یہ ایک ایسی تعریف ہے کہ جس میں گہری سے گہری اور سادے سے سادا مسیحیت بھی شامل ہے - ممکن ہے کہ مسیح کے مطالب جنکی اطاعت ایک شخص عقلی اقرار اور عملی پیروی سے کر رہا ہے (خواہ اُنکا تعلق عقل سے ہو خواہ چلن سے) شمار میں کثیر اور معانی میں عمیق ہوں - پر یہ لازمی امر نہیں کہ ہر ایک شخص کا یہی حال ہو - کیونکہ ممکن ہے کہ ایک اور آدمی بہ سبب اپنی جسمانی ساخت اور تربیت اور حالات کے ویسی ہی کوشش اور سرگرمی سے محض سادے سے چند مطالب کی اطاعت کرسکے - تو بھی دونوں مسیحی ہیں - دونوں وفادار ضمیر سے اطاعت کر رہے ہیں - بے شک ایک زیادہ پختہ مسیحی ہے مگر وہ دوسرے سے زیادہ حقیقی نہیں ہے - کیونکہ دونوں برابر حقیقی مسیحی ہیں - اب ہمارا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہئے - ہمنے یہ نہیں کہا اور نہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ آدمی مسیح میں صرف اُسی خاص بات کو قبول کرے جسے وہ پسند کرتا ہے - نہیں - یہ ہمارا مطلب نہیں ہے - ہمنے

اوپر بتا دیا ہے کہ جو بات خدا کی روح ہمپر ظاہر کرے اُسے ہمکو قبول کرنا چاہیئے - اب یہ بات ہماری پسند پر منحصر نہیں بلکہ اُس سے بالکل مختلف ہے - اور نہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ اس کا کچھ مضائقہ نہیں کہ آپ مسیح کے مطلب کو زیادہ سمجھتے یا نہیں سمجھتے ہیں - ہمارے خیال میں بڑا بھاری مضائقہ ہے - کیونکہ وہ مسیح جو مسیحی زندگی کے فتح کے ساتھ مسیحی ایمان کی دولت نہیں رکھتا وہ بڑے خسارے میں ہے - تاہم وہ کھویا ہوا نہیں ہے - پس اُس کو ہمت دلانا چاہیئے نہ کہ خارج کرنا چاہئے مسیح پہلے اس بات کو نہیں دیکھتا کہ ہم ایمان اور عمل میں کیا کچھ کر چکے ہیں - وہ پہلے ہمارے ارادے کی صفائی کو دیکھتا ہے - وہ اُس پیروی کو جو مشکلات کے پنجہ میں گرفتار ہے متہم نہیں ٹھہراتا - پر اُس پیروی کو متہم ٹھہراتا ہے جو بے وفا ہو - کہاں اور کوئی ایسا اُستاد ہے جو نیت کو فعل کی جگہ قبول کرنے کے واسطے مسیح سے زیادہ تیار رہو ۔

لیکن ہمیں ذرا زیادہ خصوصیت سے اس بات پر غور کرنا چاہیئے ہم نے یہ کہا تھا کہ آدمی کو مسیح کے مطالب کی اطاعت یا پیروی کرنا چاہیئے ضرور ہے کہ اس بات کا مطلب دریافت کیا جائے - مطلب یہ ہے کہ جو مطالب مسیح میں پائے جاتے ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو اُنکی پیروی کرنے سے یہ مراد ہے کہ جیسا آدمی کو بننا چاہیئے اور جیسا بننا اُسپر لازم ہے ویسا بنے - آؤ ہم پہلے مسیح کی حقیقت کے اُن مطالب کو جو سیرت اور ایمان اور ضمیر سے علاقہ رکھتے ہیں دیکھیں اور پھر یہ سوال کریں کہ ہمیں کس طرح کے آدمی بننا چاہیئے ؟ کس طرح کی محبت اور بھروسہ اور شکرگزاری اور فرمانبرداری اور خدمت ہماری زندگی میں ہونی چاہیئے ؟ یہ خیال دھندلا سا خیال نہیں

ہے اور نہ زندگی کے احاطہ سے بہت دور ہے - یہی زندگی ہے - جو کچھ
آپ ہیں وہی آپ کی زندگی ہے - آپ کی زندگی کے نظارے اور تعلقات
اور اسباب آپکی ہستی کے اسباب ہیں - آپ کی زندگی کے تمام معاملات
اور دلچسپیاں اور رشتے ملکر آپ کو ویسا بناتے ہیں جیسے کہ آپ ہیں - پس
ان سب باتوں میں مسیح کی پیروی کرنا ہے - ہاں آپ کا یہ کام ہے کہ آپ
یہ دریافت کریں کہ مسیح کی حقیقت زندگی کی حقیقت کے لئے کیا علاقہ اور کیا
ہدایت رکھتی ہے اور جب یہ باتیں دریافت ہو جائیں تو وفاداری سے اُنکی
پیروی کریں - پس مسیحی ہونا یا چامر صاحب کے قول کے مطابق مسیحیت کی راہ
پر چل پڑنا یہ مطلب رکھتا ہے کہ ہم اپنے ظاہری اور باطنی تجربہ کی
مختلف حالتوں میں روز بروز ان دونوں حقیقتوں کو آپس میں ملایا
کریں یعنی مسیح کی حقیقت اور اپنی زندگی کے واقعات کو باہم ربط دیا کریں
ان دونوں حقیقتوں کو اس طرح اکٹھا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بڑی
خوبصورتی سے ان میں سے ایک دوسری کو واضح اور روشن کریگی؛
پس ظاہر ہے کہ مسیحی مذہب زندگی کے کسی خاص ٹکڑے سے مثلاً
صرف رُوح کے معاملات ہی سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ کل ہستی سے
واسطہ رکھتا ہے - ہمارے خیال میں لوتھر نے کسی جگہ کہا ہے
کہ مسیحی کی زندگی سے بڑھکر اور کسی کی زندگی دنیاوی نہیں ہے -
ہاں اُس میں وہ سب باتیں شامل ہیں جو ہمیں ایسا بناتی ہیں جیسے
کہ ہم ہیں - وہ لوگ جو رومن کیتھلکوں کی طرح کلیسائی اختیارات اور رسوم
کے پابند ہیں اُنہوں نے اس بات کو ناچیز جانکر مذہب کو بڑا نقصان
پہنچایا ہے - اُنہوں نے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جما دیا ہے کہ وہ

مسیحی زندگی جو حجرے میں بسر کیجاتی ہے اُس زندگی سے اعلےٰ تر اور پاکتر ہے جو خاندان میں یا بازار میں یا دنیاوی زندگی کے دیگر تعلقات میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ صلاح دیتے ہیں کہ مقدس بننے کے لئے مقدم الذکر طرز کی زندگی کو موخرالذکر طرز کی زندگی پر ترجیح دینی چاہیئے مگر ہم حقیقت المسیح میں اِس قسم کا کوئی مطلب نہیں پاتے۔ ناصرت کا بڑھئی جو لوگوں کے درمیان کھاتا اور پیتیا آیا ہمارا اکیلا مقدس یا ولی ہے۔ یہ لازمی امر ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کو مقدس بنا کر تقدس کو دنیاوی بنائیں۔ ایک قدیم بزرگ کہتا ہے کہ "جو کچھ تم اب جسم کے متعلق کر رہے ہو وہ بھی روحانی ہے کیونکہ تم سب کچھ مسیح یسوع میں کرتے ہو" ہاں اس مسیح یسوع میں جس سے ساری چیزیں موجود ہوئیں مسیحی سب کچھ۔ سوائے گناہ کے کر سکتا ہے ۞

یہ استثنائی حالت یعنی یہ حالت کہ مسیحی سب کچھ سوائے گناہ کے کر سکتا ہے۔ ایک معیار ہے۔ مسیح کی حقیقت کے اور مطالب خواہ کیسے ہی مشکل اور قابل بحث کیوں نہ ہوں یہ بات صاف اور ایک اصولی امر ہے کہ مسیح کے ساتھ یگانگت پیدا کرنے کی دعوت اور ترغیب کا یہ مطلب ہے کہ ہم گناہ کے ساتھ جنگ کرنے میں مصروف ہوں۔ ہم اس بات کو کہ گناہ وہ چیز ہے جو اپنے سارے مقصد اور اُصول اور فعلی طاقت میں مسیح سے ذرا مطابقت نہیں رکھتا ایک اُصول سمجھتے ہیں۔ پر یاد رہے کہ ہم یہ زندگی۔ یہ مختلف پہلوؤں والی زندگی گناہ سے بچکر یا اُسپر غالب آکر کبھی بسر نہیں کرینگے جب تک کہ ہم علاوہ اُن تمام باتوں کے جو دینی زندگی کے دنیاوی تعلقات کی وسعت

کے متعلق بیان ہوئیں۔ اس سوال کے ایک اور پہلو کو بھی مدنظر رکھیں اور اُس کے متعلق دو باتوں پر صاف اور مناسب طور پر غور نہ کریں، اُن میں سے ایک دُعا ہے۔ ہماری مسیحیت اِس خطرے میں ہے کہ وہ محض ایک طریق یا ملت بنجائے۔ یعنی ایسا عقیدہ یا نمونہ بنجائے جس کے ساتھ ہم کم و بیش وفاداری کے ساتھ چمٹے رہیں۔ اب اگر ہماری مسیحیت کا یہ حال ہوجائے تو وہ ہمیں گناہ کی اُن لگاتار اور پیچیدہ اور مختلف آزمائشوں میں جو اِس زندگی میں حادث ہوتی ہیں فتح نہیں بخشیگی اِن سب باتوں کی پشت پر اور اُنکے اندر ضرور ایک شخصی عنصر ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ مسیح کا یہ مطلب ہے کہ خدا بڑے اختیار اور رحم کے ساتھ اور عجیب صورت میں ہمارے ساتھ حقیقی اور نزدیکی طور پر واسطہ رکھتا ہے۔ پس ایسا نہ ہو کہ ہمارا مذہب صرف ایک مسئلہ بنجائے جسکا مطالعہ ہم کیا کریں یا محض ایک فرض ہوجائے جسے ہم بجالائیں اور بس۔ نہیں وہ اس سے بڑھکر ہے۔ وہ ایک بلاہٹ ہے۔ وہ ایک مَس ہے وہ ایک طرح کی صحبت ہے۔ وہ ایک سننے والی ضمیر اور عجائبات الٰہی کو دیکھکر دنگ ہونے اور خدا کے سبب کاموں کے ملاحظہ سے خوف کھانے والی روح اور محبت اور خاکساری سے بھرے ہوئے دل کا مذہب ہے۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جنپر گناہ کا زور نہیں چلتا۔ اب یہ باہمی مکالمہ جو خدا اور انسان کے درمیان پایا جاتا ہے حقیقی اور کامل صورت کے ساتھ اُس سادہ اور لازمی عادت میں جسے دعا کہتے ہیں ظاہر ہوتا ہے۔ اور سب باتوں سے زیادہ ہم دعا کے وسیلے سے خدا کی حضوری میں آتے اور اس علم کو کہ خدا

اپنی ذات میں کیا ہے اور ہمارے لئے کیا ہے۔ یقینی طور پر پھر
تازہ کرتے ہیں۔ کوئی شخص اس عادت کے بغیر گناہ سے نہیں بچ سکتا
دعا کی اُس عملی طاقت کی نسبت جس سے گناہ مغلوب ہوتا ہے بہت
کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔ آپ اپنی زندگی کا کوئی
الجھانے والا گناہ لیں۔ اور اُس سے رہائی پانے کے لئے دعا مانگیں
نتیجہ کیا ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ گناہ اور دعا دونوں باہم نہیں رہ سکینگے۔
یا تو آپ کی دعا آپ کے گناہ کو مار ڈالیگی یا آپ کا گناہ آپ کی دعا کو
مار ڈالیگا۔ پس اِس بات کے دریافت کرنے کا کہ آدمی اپنی زندگی
کے گناہ کے ساتھ کیسا سلوک کر رہا ہے سب سے عمدہ معیار یہ ہے کہ
کہ وہ یہ دیکھے کہ اُس کے باطن میں اِن دونوں چیزوں میں سے کونسی
چیز زندہ بچی ہے۔ گناہ یا دعا ÷

دوسری بات جس پر ہمیں غور کرنا چاہئے اور جسے قبول کرنا چاہئے
ذاتی تربیت اور خود انکاری ہے۔ ہم نے ابھی اس بات کا دعوٰے
کیا تھا کہ مسیحی زندگی نہایت وسیع ہے اور دنیا کی ہر بات پر چھا جاتی
ہے یعنی ہر بات میں مسیح کی تابعداری کرتی ہے۔ پر یاد رہے کہ کوئی
شخص اِس وسیع زندگی میں جو آدمی کو اپنے قابو میں کر لیتی ہے چلتا
ہوا مسیح کے ہر طلب کو جو اُس کی زندگی سے علاقہ رکھتا ہے قبول
کرنے کے لئے "ہاں" نہیں کہہ سکتا۔ جب تک کہ وہ کئی باتوں کے
متعلق "نہ" نہ کہے۔ اور یہ "نہ" اُسے صرف اُنہی باتوں کی نسبت
نہیں کہنا پڑتا ہے جو صاف طور پر گناہ ہیں بلکہ بعض دفعہ اُن
باتوں کی نسبت بھی "نہ" کہنا پڑتا ہے جو بظاہر گناہ نہیں ہوتی ہیں

اِس کا سبب یہ ہے کہ ہمنے اپنی مسیحیت کو ایک ناکامل اور ایک تیز معتبر آلہ کے وسیلے کمال کو پہنچانا ہے۔ عالمان علم الٰہی اُسے "گری ہوئی نیچر" کہا کرتے ہیں۔ چاہے آپ انسانی طبیعت کو یہ نام دیں یا نہ دیں پھر یہ بات ضرور اُسپر صادق آتی ہے کہ وہ اکثر اوقات اخلاقی طور پر واجب باتوں کو بھی کھینچکر زندگی کے متعلق ایسے معنوں میں لیجاتی ہے جنکو مسیح قبول نہیں کرسکتا۔ وہ آدمی جو اِس بات کو صحیح نہیں مانتا وہ یا تو انصاف پسند نہیں ہے۔ یا اُس میں سوچنے کا مادہ نہیں ہے یہی دنیا وہ جگہ ہے جہاں لوگوں کو مسیحی بننا پڑتا ہے۔ پر یاد رہے کہ یہی وہ جگہ بھی ہے جہاں وہ مسیحی نہیں بنتے۔ یہیں ہمیں دیندار بننے کا حقیقی موقعہ ملتا ہے مگر وہ موقعہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم زندگی کو چھوڑکر بھاگ جائیں۔ ہم یاد رکھیں کہ جو خطرات آدمی کے فرض کی راہ میں آتے ہیں اُن کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ آدمی اُنپر فتح پاکر بہتر بنے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ وہ اپنی تربیت کرنا اور خودانکاری کو کام میں لانا سیکھے جو باتیں مسیح کی کامل اور وفادار اطاعت کو نقصان پہنچانیوالی ہیں اُنکو دور کرے۔ ہاں اُسے اِس بات کو اور اُس کام کو ترک کرنا چاہئے۔ اور اِس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ سب باتوں پر پھر نظر ڈالنا اور اُنکی اصل وقعت دریافت کرنا اور اُنہیں نئے طور پر ترتیب دینا سیکھے۔ ممکن ہے کہ ہم میں سے بعضوں کو اپنے اور اپنے پڑوسیوں کے لئے یہ بات اوروں کی نسبت بار بار کرنی پڑے شاید بعضوں کو خداوند مسیح کے حکم کے مطابق اپنے دہنے ہاتھ کو کاٹنا

یا اپنی دہنی آنکھ کو نکالنا پڑے۔ وہ جو زیادہ اونچا ہوتا ہے ہمیشہ زیادہ تقلید کے لائق نہیں ہوتا۔ بلکہ جیسا مسیح نے کہا ہمیں "ٹنڈا یا لنگڑا ہو کر آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا" پڑتا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں اُن سب کو ایسا کرنا پڑتا ہے جو اس پیچیدہ زندگی میں کامل طور پر اور وفاداری کے ساتھ مسیح کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض باتیں درحقیقت بڑی خود انکاری کی باتیں ہوتی ہیں مگر وہی لوگوں کو بہت کم نظر آتی ہیں وہ پُرجوش طبائع جو زندگی کو بھی پیار کرتی ہیں مگر مسیح کو زیادہ کرتی ہیں اپنی سادہ اور خاموش نفس کشی میں کچھ ایسی چیز رکھتی ہیں جو عجیب طور پر آدمی کو شرافت کے اعلےٰ درجہ تک پہنچانے والی ہوتی ہے۔ اگر یہ نفس کشی کا کام مسیح کے لئے کیا جائے تو خوشی سے کیا جائیگا۔ اور شاید کسی دن وہ اسکا پورا پورا اجر بھی دیگا۔ ایک شاعر نے انگریزی میں ایک مثنوی لکھی ہے اُس کی چند ابیات کا ترجمہ ذیل میں بصورت نثر درج ہے۔ اُنکا یہی مطلب ہے۔

اُس نے کہا میرے لئے وادی میں ایک جھونپڑی بناؤ\
جہاں میں سوگ کروں اور دعا مانگوں۔ مگر\
میرے محلوں کے برجوں کو نہ گرانا جو کہ ایسے\
ہلکے اور ایسے خوبصورت بنے ہوئے ہیں۔\
شاید میں اوروں کے ساتھ پھر وہاں جاؤں۔\
یعنی اُس وقت جبکہ میرا جرم دور ہو جائے۔

آخری دو سطروں سے زندگی کے متعلق یسوع کے مطلب کا ایک

اور پہلو نظر آتا ہے اور اب ہم اُسپر دو چار باتیں کہینگے - یہ سطریں ایک وسیع مستقبل کو ہمارے سامنے لاتی ہیں - ہمنے ابھی ابھی کہا تھا - کہ زندگی ہی وہ جگہ ہے جس کے حالات اور تعلقات کے درمیان ہمیں مسیحی بننا پڑتا ہے اور ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں مسیح کی اطاعت ادھوری اور ناکامل رہتی ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہم اُسے قائم رکھنا چاہیں تو یہ یاد رکھیں کہ وہ جنگ اور دعا اور خود انکاری کے وسیلے قائم رہیگی - پر ہم یہ بھی یاد رکھیں کہ زندگی کے بعد موت آتی ہے - وہ ایک عظیم اور حقیقی واقعہ ہے - ہاں وہ ایسا عظیم اور حقیقی واقعہ ہے کہ زندگی کے ہر سچے اور تسلی بخش تصوّر کو اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے - بلکہ کچھ نہ کچھ ضرور اُسکی نسبت کہنا چاہیئے - اب حقیقت المسیح ایسا ہی کرتی ہے - یعنی مسیح کی حقیقت کا سب سے آخری مطلب آئندہ سے وابستہ ہے مسیح وہ ہے جو نہ صرف "تاریخ میں "تھا" اور تجربہ میں "ہے" بلکہ وہ وہ ہے جو آئندہ میں "آنیوالا ہے"۔ مگر اُس آئندہ کی نسبت ہمیں بہت علم نہیں ہے وہ اُن باتوں میں شامل ہے جنپر سچا مذہب بھی بہت روشنی نہیں ڈالتا - پر اگر مسیح کے مطالب اِس دنیا میں ہماری سیرت اور ایمان اور ضمیر کے لئے سچے وعدے ثابت ہوتے ہیں تو شک نہیں کہ وہ مطلب بھی جو آنیوالے مسیح سے علاقہ رکھتا ہے ہر ایک چیز سے جو اس دنیا میں ہے "زیادہ بہتر ثابت ہوگا - مسیح کا یہ مطلب جو آئندہ سے تعلق رکھتا ہے ایسا ہی نتیجہ پیدا کریگا - اگر وہ ہمیں اُس نیکی سے جو اب مشکلات میں پھنسی ہوئی ہے اور بوجھ سے دبی ہوئی ہے اور ناکامل ہے اُس

نیکی کی طرف لیجائے جو محفوظ اور فاتح اور وسیع ہے اور ساتھ ہی زیادہ حقیقی اور شخصی اور زندہ بھی ہے۔ پولوس رسول کا یہی خیال تھا چنانچہ اُسنے کہا ہے "میرے لئے جینا مسیح ہے" اور پھر یہ الفاظ اضافہ کئے ہیں "مرنا نفع ہے"۔

شاید یہ بات نادرست اور مشکل معلوم ہو پر ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ مسیحی مذہب میں اور کوئی بات ایسی نہیں ہے جو ہمیں اس مذہب کی الہٰی تدبیر سے قائل کرے جیسی یہ بات ہے کہ یہ مذہب اس دنیا کی زندگی کے لئے بھی اور آنیوالی دنیا کی زندگی کے لئے بھی نہایت موزوں ہے۔ اِسی لئے وہ یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ میں وہ مذہب ہوں جس کی ضرورت بنی آدم کو ہے۔ مسیح زندگی کے لئے ہے۔ اور حقیقی اور سچے دنیاوی معنوں میں زندگی کے لئے ہے۔ اور ہم بھی حقیقی اور سچے دنیاوی معنوں میں زندگی کے لئے ہیں۔ ہاں ہم بھی اِس زندگی کے لئے ہیں جنہیں یہ زندگی نہایت جوش اور زور سے اور پُرلطف لہجہ سے دعوت دیتی ہے۔ لیکن جب ہم زیادہ گہرے اور مناسب طور پر اُس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں تو کیا ہمپر یہ بات نہیں کھُلتی کہ یہ دعوت کسی اور بات کے لئے بھی ہے۔ یہ زندگی واقعی اچھی ہے مگر اُس کی اچھائی ہی میں یعنی صداقت یا محبت یا سیرت یا بنی آدم کی خدمت ہی میں عجیب قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں جو اُس زندگی پر دلالت کرتے ہیں جو اِس سے بہتر ہے۔ زمانہ حال میں ایک سوانح عمری شائع ہوئی ہے۔ اُس میں جس شخص کے سوانح قلمبند ہیں وہ کہتا ہے "مینے زندگی کو شیریں اور چمکیلا اور خوبصورت پایا۔ اور میں بہت چاہتا

ہوں کہ اگر موقع ملے تو میں پھر اُس میں سے گزروں"۔ کیا یہ خواہش اِس تجربہ کا حقیقی اور سب سے گہرا نتیجہ ہے؟ کیا اِس زندگی کی ایک سچی اور نہایت گہری بات یہ نہیں ہے کہ اسکی شیرینی اور چمک اور خوبصورتی ہی میں اُس حالت کا جو اِس سے بھی شیریں تر اور زیادہ چمکدار اور زیادہ خوبصورت ہے اشارہ پایا جاتا ہے؟ کیا یہی وہ بات نہیں ہے جو ہمارے کاموں کو نہایت نازک رنگوں سے رنگین کرتی اور ہمارے جذبات میں بے ریا رقت بھر دیتی ہے اور نیچر کو اوس نفیس مطلب سے بھر دیتی ہے جو ہماری زبان سے یہ الفاظ نکلواتا ہے کہ سب سے چھوٹا پھول بھی ایسے خیالات پیدا کرتا ہے جن تک آنسو کبھی نہیں پہنچ سکتے"۔ لامحدود خدا کا سمندر اُس محدود عالم کے کنارے تک پہنچتا ہے جس میں ہم اب رہتے ہیں۔ جب ہم یہاں سیری کے لئے آہیں بھرتے ہیں تو ہم یہ نہیں جانتے کہ اس دنیا میں سیری یا آسودگی خودکشی کی ایک صورت رکھتی ہے۔ بیشک ہم اِس زندگی کے لئے بنائے گئے ہیں تاہم بالکل اسی کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ اِس لئے کہ اس کے بعد ہمیں ایک "بہتر" زندگی نصیب ہو اور یہی حال ہماری مسیحیت کا ہے۔ جس سچ نے ہماری اِس زندگی کی تربیت کے لئے ایسے مناسب معنے اور مطالب ظاہر کئے ہیں وہی اُس وقت بھی جبکہ اِس تربیت کا آخری باب آئیگا اور ہم آئندہ کی طرف دیکھینگے ہماری نیچر کے لئے ویسی ہی مناسب بھرپوری جواب ظاہر ہو رہی ہے ظاہر کریگا۔ پس وہ جو مسیحی ہے ہر روز خدا کی تعریف کرتا اور اُس دن بھی کریگا جو کہ آدمی کی زندگی کا سب سے بڑا دن ہے۔ یعنی

موت کے دن بھی اسکی تعریف کریگا اور بے خوف اور بے گڑگڑائے مسیح کی لامحدود حقیقت کے بے بیان مطالب میں داخل ہوگا ۔

ہمیں اب اس مضمون کو بند کرنا چاہیئے مگر بند کرنے سے پہلے ہم اُن بہت سے سوالوں میں سے جو باقی رہگئے ہیں ایک سوال پر چند کلمات کہنا چاہتے ہیں - ہم ابھی اس بات کا ذکر کر رہے تھے کہ مسیحی ہونا کسے کہتے ہیں - پر اب یہ سوال برپا ہوتا ہے کہ ہم کیوں مسیحی ہوں؟

واضح ہو کہ انسان کے دل میں دو آوازیں آتی ہیں اور انمیں سے کوئی بھی دیر تک کسی سنجیدہ مزاج اور راستی پسند آدمی کے دل میں خاموش نہیں رہتی - ایک آواز تو اُس کے باطن ہی میں اُٹھتی ہے اور وہ اُسی آدمی سے علاقہ رکھتی ہے - وہ دنیا کی بھیڑ پر دروازہ بند کر دیتی ہے کیونکہ دنیا میں ہم آسانی سے اپنی ذمہ واریوں کو بھول جاتے ہیں بلکہ اپنی اخلاقی حقیقت کو بھی فراموش کر دیتے ہیں - لیکن وہ آواز دنیا کا دروازہ بند کر کے ہم سے تنہائی میں ہماری سیرت اور انجام کی نسبت بات چیت کرتی ہے - وہ آواز بہت دھیمی ہوتی ہے دوسرے کو سنائی نہیں دیتی بلکہ اکثر اوقات اُسی انسان کے اندر جس میں کہ بولتی ہے بآسانی خاموش ہو جاتی ہے - لیکن جب کبھی ہماری زندگی میں شور بند ہو جاتا ہے اور ایک قسم کی خاموشی چھا جاتی ہے اور خصوصاً جب یہ گہری خاموشی ہماری قواء کو اس آواز کو سُنکر چپ کرا دیتی ہے تو یہ آواز بڑی صفائی سے بولتی اور ہم اس کی ایک ایک بات کو سُنتے ہیں - لیکن دوسری آواز چھوٹی یا دھیمی نہیں ہوتی - وہ طرح طرح کا شور ہے جو بنی آدم اپنے غم اور محنت میں مبتلا ہو کر بلند

کرتے ہیں - وہ کبھی سمندر کی لہروں کے شور کی طرح برپا ہوتا ہے اور
کبھی اُس ہوا کی آواز کی مانند ہوتا ہے جو جنگل میں چلتی ہے - یہ شور بھی
خود غرضی کے سبب سے - ہاں مذہبی خود غرضی کے سبب سے بند ہو جاتا
ہے - کیونکہ خود غرضی کان کو بہرہ اور دِل کو مردہ بنا دیتی ہے - تاہم
یہ شور بار بار اُٹھتا ہے اور لوگوں کے آرام میں خلل انداز ہوتا ہے اور
اُنکے اندر خود غرضی کی زندگی سے بہتر زندگی کے خیالات پیدا کرتا ہے
یہ وہ دو آوازیں ہیں جو ہمیشہ انسان کے دِل میں آتی رہتی ہیں -
یہ ہیں تو دو مگر اِنکا پیغام ایک ہی ہے وہ گویا اِس بات کی دعوت
دیتی ہیں کہ ہم یسوع کو دیکھیں اور اُس سے سیکھیں - اگر ہم اچھی طرح
جینا اور تسلی کے ساتھ مرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مسیح کی پہلے اپنے ہی
لئے ضرورت ہے - اور پھر اگر ہم کسی عمیق اور حقیقی طریق پر دوسرونکی
خدمت کرنا چاہتے ہیں تو تو بھی ہمیں اُسی کی ضرورت ہو گی - پس ہمیں
اپنی خاطر اور نیز اپنے بھائی کی بھلائی کے لئے جو محبت ہم سے طلب کرتی
ہے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم مسیحی ہوں - اور اگر ہم غور
کریں اور اِس حقیقت کو جیسی کہ ہماری زندگیوں میں اور مسیح کی حقیقت
میں درخشاں ہے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ ایک ایسی بے قیاس
نیکی اور ایسا بے بیان فضل جس کا حق ہم نہیں رکھتے موجود ہے
جسے خدا نے ہمپر ظاہر کیا ہے ؛

ہمارے مسیحی ہونے کی وجوہات یہ ہیں - یسوع نے اپنی نسبت فرمایا
"میں حق ہوں" ان لیکچروں میں ہمنے کلیسیا کے اختیار سے یا بائبل سے
دلائل پیش نہیں کیں - ہمنے صرف یہ کوشش کی ہے کہ ہم مسیح کی حقیقت کو

بیان کریں - اور اگر وہ "حق" ہے تو وہ اپنی سند آپ ہے - کیا وہ ہمارے
اور عقل اور ضمیر کے لئے ایسی حقیقتیں ظاہر نہیں کرتا جو ایک گہرے
اور حقیقی معنوں میں حق ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو مسیحی ہونا سچی زندگی کا
پہلا اصول ہے ٭

فہرست کتب جدید

جان ہیلیفکس جنٹلمین - ایک مشہور اخلاقی اور پُرنصیحت قصہ - جلد اول ۱۲ ر

مونگے کا جزیرہ - انگریز جہازرانوں کے عجیب وغریب سفر و معرکے - قیمت ۸ ر

خاندان شونبرگ کوٹا کے حالات - انگریزی کے ایک نہایت مشہور اور ہردلعزیز ناول کا ترجمہ - قیمت ۱۲ ر +

بن شبیر - رومی بادشاہوں کے جور وستم زمانہ کا ایک ناول مع تصویر - قیمت ۱۲ ر

ن - رومی قیصروں کے عہد کا دلچسپ فسانہ - قیمت ۸ ر

جبینۃ الکبریٰ کی آتشزدگی - نیرو قیصر روم کے زمانے کا دلچسپ تاریخی ناول قیمت ۶ ر

کی کشمکش - ابتدائی سن مسیحی کا ایک تاریخی ناول - قیمت ۶ ر +

خدن یعنی رفیق صلیب - خداوند یسوع مسیح کے حالات قصہ کے پیرایہ میں قیمت ۶ ر

یا کی حق شناسی - محل قیصر روم میں انجیل کی اشاعت - قیمت ۴ ر +

شاہزادہ بن داؤد - پہلی صدی عیسوی کے متعلق نہایت دلچسپ ناول - دو حصے - قیمت عہ ر +

اس تگاسنی - چوتھی صدی مسیحی کا نہایت دلچسپ قصہ - قیمت ۶ ر

مسافر کا احوال - بنین صاحب کی مشہور عالم کتاب یعنی خواب کے پیرائے میں روحانی سفر کا قصہ حصہ اول ۶ ر - حصہ اول و دوم مکمل ۱۲ ر

ئبل - مع حالات دیگر اقوام جن کا بائبل میں ذکر ہے ضخیم کتاب ہے قیمت ۱۲ ر

المسیح - مسیح کی زندگی کے مفصل حالات مع مفید مطالب - قیمت ۱۲ ر

ونہ - ڈاکٹر سٹاکر صاحب کی مشہور کتاب جس میں ہر امر پر خداوند مسیح کی زندگی کے سبق درج ہیں - قیمت ۸ ر +

مسیح کی پیروی - ٹامس لے کمپس کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ - قیمت ۸ر +

طریق دعا - میڈم گیون صاحبہ ایک مشہور فرنچ لیڈی کی کتاب سے ترجمہ ہوئی - روحانی زندگی کے لئے نہایت مفید ہے - قیمت ۴ر +

حیات داؤد - جس میں حضرت داؤد کی زندگی کا مفصل حال اور اس سے جو روحانی سبق حاصل ہوتے ہیں درج ہے - قیمت ۱۲ر +

مسیح کے خاص دوست - جس میں خداوند یسوع مسیح کے خاص حواریوں اور دیگر اشخاص درج ہے - قیمت ۶ر +

مکتب مسیح میں دعا کی تعلیم - دعا کے متعلق ہدایات از مرے صاحب - قیمت ۶ر

طریق تسلیم - رضائے الٰہی کی اطاعت کے متعلق ہدایات از مرے صاحب قیمت ۶ر

یاد محبوب - صبح و شام کے لئے - میکڈف صاحب کی مشہور کتاب - قیمت ۴ر +

مقدس آگستینوس کے اقرارات - قدیم زمانے کی نہایت مشہور روحانی کتاب قیمت

الہام بائبل - مسئلہ الہام پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے - قیمت ۸ر +

یسوع مسیح کی گرفتاری اور موت - تاریخی اور روحانی طور پر بحث کی ہے قیمت ۱۲ر

زندہ مسیح اور اناجیل اربعہ - مسیحی تجربہ اور اناجیل کی صحت کے تاریخی ثبوت - ۱۲ر

عیسیٰ کی سیرت - عادات و خصائل پر مفصل بحث کی ہے - قیمت ۱۰ر +

مسیحی دین اور اخلاق - جس میں انگلستان کے ایک مشہور عالم نے فلسفیانہ طور پر مسیحی مذہب پر بحث کی ہے - قیمت ۸ر +

نجات کی تعلیم - جس میں ڈاکٹر ہوپر صاحب نے مسیحی - محمدی اور ہندو مذاہب کی تعلیم نجات پر بحث کی ہے - قیمت ۱۲ر +

درخواستیں بنام اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی لاہور آنی چاہئیں